ارتفاقاتِ معاشیہ

یعنی

امام ولی اللہ دہلوی ؒ

کا

فلسفۂ عمرانیات و معاشیات

از

شیخ بشیر احمد بی۔اے لودیانوی

ادارۂ حکمتِ اسلامیہ ۴ اردو بازار لاہور

اِرتفاقاتِ معاشیہ

یعنی

اِمام وَلِیُّ اللہ دہلویؒ

کا

فلسفۂ عُمرانیات و معاشیات

جس میں

حکمتِ وَلِیُّ اللّٰہی کے مطابق موجودہ زمانے کے عُمرانی و معاشی مسائل کا وہ حل پیش کیا گیا ہے، جو حجازی انقلاب کے پہلے دَور میں کامیابی حاصل کر چکا ہے۔

از

شیخ بشیر احمد بی اے لودیانوی

شائع کردہ

اِدارۂ حکمتِ اسلامیہ

۴ - اُردو بازار، لاہور

اِرتفاقاتِ معاشیہ

یعنی

امام وَلیُّ اللہ دہلوی رح

کا

فلسفۂ عمرانیات و معاشیات

جس میں

حکمتِ وَلیُّ اللّٰہی کے مطابق موجودہ زمانے کے عمرانی و معاشی مسائل کا وہ حل
پیش کیا گیا ہے، جو حجازی انقلاب کے پہلے دور میں کامیابی حاصل کر چکا ہے

از

شیخ بشیر احمد، بی۔ اے، لودیانوی

شائع کردہ

اِدارۂ حکمتِ اسلامیہ

۴۔ اردو بازار لاہور

تعداد اشاعت: ۱۰۰۰ طبعِ دوم

ناشر	شیخ بشیر احمد، بی اے، لودیانوی
مقامِ اشاعت	ادارۂ حکمتہ اسلامیہ، ۴۔ اردو بازار لاہور
مطبع	اشرف پریس، ایبک روڈ لاہور
تعداد	ایک ہزار
ایڈیشن	دوم
تاریخ اشاعت	۱۹۶۹ء
قیمت	

دریا بہ حباب اندر

مضمون	صفحہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

سب تعریف اُس خدائے وحدہٗ لاشریک کو زیبا ہے، جس نے انسان کو خلعتِ وجود بخشا۔ اُسے وحی کے ذریعے سے معاشیات و عمرانیات کے اصول اور قاعدے سکھائے، اپنے قریب پہنچنے کے طریق الہام کیے اور اُسے اِن عُلوم کے سبب سے تمام حیوانوں پر فوقیت عطا کی۔ پھر اُس کی فطرت میں جو باتیں رکھی ہیں، اُن کی یاد دہانی کے لیے نبی بھیجے، جنھوں نے انسانی معاشرے کی اصلاح کی کوشش کی۔ اُن سب میں افضل و اعلیٰ حضرت محمد مصطفیٰ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ ہیں، جو ایک تو عرب کے قومی نبی بنا کر بھیجے گئے، تاکہ مکۂ معظمہ اور اس کے اردگرد کی بستیوں کو معاشی نظام کی خرابی اور خداشناسی سے فراموشی کے خطرناک نتائج سے آگاہ کریں اور دوسرے سب قوموں کی رہنمائی کے لیے بین الاقوامی تعلیم اور اس تعلیم کو قیامت تک تمام قوموں پر غالب کرنے کا منصوبہ (Plan) دے کر بھیجے گئے

خداوند تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں اور برکتیں ہوں، آپؐ پر اور آپؐ کے فدا کار ساتھیوں پر، جنھوں نے مل کر پہلے عرب میں قرآنی اصول پر، جو حقیقت میں انسانیت کے بنیادی اصول ہیں، انقلاب بپا کیا اور پھر آپؐ کے ساتھیوں کے اجتماع نے قیصر و کسریٰ کے غلط اقتصادی نظاموں کو برباد کر کے، جن کے تحت انسان اپنی انسانیت سے گر گیا تھا، وہ نمونے کی بین الاقوامی حکومت پیدا کر دکھائی، جو رہتی دنیا تک صحیح معاشی انقلاب اور اقتراب (خدا شناسی) کے نظام کا بہترین نمونہ رہے گی۔

خدا کی بہت بہت رحمتیں ہوں، اُن اصحابِ فکر پر، جنھوں نے قانونِ الٰہی (قرآنِ حکیم) کو انسانی معاشروں میں جاری کرنے کے اصول وضع کیے۔ اُن میں سے آخر میں اور بہت بڑا وہ صاحبِ فکر ہے، جسے دُنیا امام ولی اللہ دہلویؒ کے نام سے جانتی ہے۔ اُس نے اُس وقت، جب دُنیا قرآن کو بھول چکی تھی، اُس کی حکمتوں کو اُجاگر کیا اور اس تعلیم کی بنا پر صحیح معاشی و اقتصادی اصول پر عالمگیر انقلاب کی طرح ڈالی، تاکہ دنیا سے معاشرتی اور معاشی ظلم دُور ہو اور وہ صحیح خدا پرستی سے روشناس ہو اور اس کے لیے پہلے قرآنی انقلاب کو جو حجاز میں آیا، اپنا رہنما بنایا۔

أَمَّا بَعْدُ بندۂ ضعیف، بشیر احمد (وَفَّقَهُ اللّٰهُ لِعَمَلِ) ابن شیخ الدین مرحوم و مغفور لودیانوی، عرض پرداز ہے، کہ اس زمانے میں کہ وادیٔ چین سے ریفِ مراکش تک اور برفستانِ ٹنڈرا سے ریگزار کالاہاری تک پاکستان سے باہر کہیں بھی ایسی حکومت نہیں ہے، جس کا قیام صحیح انسانیت کے اصول پر

ہو اس لیے ضروری ہے، کہ پاکستان کو تیار کیا جائے، کہ صحیح انسانیت کے اصول پر، جن کی تدوین قرآن حکیم میں کی گئی ہے، ایک عالمگیر انقلابی حکومت کا مرکز بنے۔ چونکہ برعظیم پاک و ہند میں اس کی دعوت سب سے پہلے حجۃ الاسلام، امام الحکمت، امام ولی اللہ دہلویؒ نے دی، اس لیے ہمارا فرض تھا کہ سب سے پہلے اس برعظیم کے مسلمان ہی اس دعوت پر لبیک کہتے۔ چنانچہ ہمارے بزرگوں نے امام ولی اللہ دہلویؒ کی جماعت کی تحریک کو برِعظیم پاکستان و ہند کے اندر کامیاب بنانے میں جو سرگرم کوششیں اور جانفشانیاں کیں، اُن کے ذکر سے اس برعظیم کی تاریخ کے صفحات روشن ہیں۔ لیکن اِس زمانے میں اکثر نوجوان اس حقیقت سے بالکل بے خبر ہیں کہ اس برعظیم کی تاریخ میں ان بزرگوں کا کیا مقام ہے، بلکہ خود مسلمان بھی اپنے ان بزرگوں کے عظیم الشان کارنامے کو اور اپنے اصحابِ فکر کے اس بلند فکر کو فراموش کر کے یہ خیال کر بیٹھے ہیں، کہ حضرتِ امام الحکمۃ، امام ولی اللہ دہلویؒ صرف ایک فاضل ملّائے مسجدی تھے، جنھوں نے کوئی دعوتِ فکر و عمل نہیں دی یا زیادہ سے زیادہ وہ ایک اچھے مفسّر تھے، جن کی کتابیں عربی مدرسوں میں پڑھائی جا سکتی ہیں اس لیے ضروری ہے، کہ حضرت امام الحکمت کا فکر اُن کی تصنیفات میں سے نکال کر دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس سلسلے میں پہل اس فاضل اجلّ، امامِ انقلاب، ماہر علومِ ولی اللّٰہی کو حاصل ہے، جسے دُنیا عُبیدُ اللہ سندھیؒ کے نام سے جانتی ہے۔ اُس نے قرآنی انقلابی تعلیم سے متاثر ہو کر

اپنے آبائی دھرم، اپنے ماں باپ، عزیز رشتے دار اور آخر میں اسی تعلیم کو سربلندی دینے کے لیے وطنِ عزیز تک کو خیرباد کہی۔ اُس نے امام الحکمت، امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفے کو زندہ کیا۔ زندہ کیا گیا، اُسے آج کل کے اہلِ عقل کو سمجھانے کے لیے اُن کی زبان میں پیش کیا۔ اہلِ وطن ابھی اُس کی صحیح عظمت کو نہیں پہچان سکے اور اس بے نفس، فاضلِ یگانہ کے انقلابی کارناموں سے بے خبر ہیں۔ لیکن مسلمانانِ برِ عظیم پاک و ہند اُس صابر و شاکر، نفس کُش، فقیر منش انقلابی کے کارناموں کا صحیح اندازہ لگانے کے قابل ہو جائیں گے، تو اُس کی پوری پوری قدر پہچانیں گے۔ اُس وقت اُنہیں معلوم ہوگا، کہ حضرتِ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اُنہیں امام الحکمۃ امام ولی اللہ دہلویؒ سے روشناس کرا کے اُن پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔

اوراقِ مابعد اسی اُستاذِ حکمتِ ولی اللّٰہی کے فیض کے ممنونِ احسان ہیں۔ اُن میں جو صحیح ہے، اُس کا ثواب اُن کی روح پُر فتوح اور اُن کے اساتذہ کرام کی ارواحِ مقدسہ کو پہنچے اور جہاں لغزشِ فہم و قلم ہو گئی ہو، خدائے رحیم و کریم اپنے نبیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے جاں نثار رفقاء کرام کے طفیل معاف فرمائے۔ کیونکہ اس میں عمد کو دخل نہیں۔ وَاللّٰہُ عَلٰی مَا اَقُوْلُ شَھِیْدٌ، وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی نَبِیِّہِ الْکَرِیْمِ وَاَصْحَابِہِ الْعِظَامِ۔

المخلص بشیر احمد، بی۔ اے، لودیانوی

۲۲۳ ابن سمن آباد، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

حکیم الملت امام ولی اللہ دہلویؒ کے مختصر حالات اور تعلیمات

پس منظر ہندو آریوں کی تہذیب و شائستگی اور نظام اخلاق و سیاست کی لہریں مدھم پڑ جانے کے بعد محمود غزنوی کے زمانے کے قریب شمال مغرب کے مسلمانوں کی آمد سے جس نئی تہذیب و شائستگی کا سیلاب برعظیم پاک و ہند پر چھایا، اُس کی رَو کا زور بھی اٹھارویں صدی کے شروع میں ٹوٹ گیا۔

سلطان عالمگیر کی وفات کے بعد مسلمانوں کے پیدا کردہ نظام میں ایسا خلل پڑا کہ مسلمانوں کی مرکزی حکومت کے قائم رہنے کی کوئی صورت نہ رہی۔ چنانچہ حکمران طبقہ انسانیت کے اصول بھول چکا تھا اور عوام ان کے ظلموں کا شکار ہو رہے تھے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرے کے تمام طبقے انسانی بزرگی سے عموماً گر گئے +

اُس زمانے میں اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات سے چار سال پہلے دہلی کے ایک متوسط گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا، جو بڑا ہو کر اس برعظیم کو ایک فلسفہ دینے والا تھا، باپ نے اس کا نام قطب الدین بن احمد رکھا، لیکن دنیا اُسے شاہ ولیؒ اللہ کے نام سے جانتی ہے (رحمۃ اللہ علیہ)

آبا و اجداد امام ولی اللہ دہلویؒ کا سلسلۂ نسب والد کی جانب سے سیدنا فاروق اعظمؓ تک اور والدہ کی جانب سے حضرت موسیٰ کاظمؓ تک پہنچتا ہے۔ یعنی آپ والد کی جانب سے فاروقی اور والدہ کی جانب سے فاطمی تھے +

آپ کے آبا و اجداد اس برعظیم کی سوسائٹی میں ابتداء ہی سے بڑی بزرگی کے مالک رہے۔ اُن میں سے بعض نے علم و فضل میں اور بعض نے بہادری، سخاوت اور سرداری میں ممتاز شہرت حاصل کی۔ آپ کے بزرگوں میں سے سب سے پہلے شیخ شمس الدین مفتی اس برعظیم میں تشریف لائے اور رہتک میں مقیم ہوئے، جو دہلی سے تیس میل پر واقع ہے۔ شیخ موصوف بہت بڑے عالم اور زاہد تھے اُنہوں نے رہتک میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ رفتہ رفتہ آپ کے اثر سے اس علاقے میں اسلام پھیلنا شروع ہوا اور

اہلِ شہر نے دینی باتیں سیکھنے اور اپنے مقدمات فیصل کرانے کے لیے آپ کو اپنا رئیس بنا لیا۔ اس طرح آپ ایک لحاظ سے حاکمِ شہر بن گئے۔ کچھ مدّت بعد قضا کا عہدہ سرکاری طور پر بھی آپ کے خاندان میں مسلّم ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس خاندان کے ایک بزرگ شیخ قوام الدین نے فوجی زندگی اختیار کرلی اور ساری عمر جہاد میں صرف فرمادی۔ اُن کی اولاد نے بھی یہی طرزِ زندگی قبول کرلی۔ چنانچہ حکیم الملت امام ولی اللہ کے دادا شیخ وجیہہ الدینؒ سلطان عالمگیر کے لشکر میں ایک بڑے معزز عہدے پر مقرر تھے۔ وہ سپاہی بھی تھے اور عالم و فاضل اور خدا رسیدہ بھی۔ اُنہوں نے بہت سے فوجی معرکوں میں حصّہ لیا، لیکن تمنا یہی رہی کہ شہادت کی زندگی نصیب ہو۔ آخرکار دریائے نربدا کے قریب اپنے قافلے کے ساتھ ڈاکوؤں کے ایک گروہ سے لڑتے ہوئے بہت سے زخم کھا کر شہید ہوگئے۔

شیخ وجیہہ الدین کے تین فرزند تھے: شیخ ابوالرضا محمدؒ، شیخ عبدالرحیمؒ اور شیخ عبدالحکیمؒ۔ ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک فاضل یگانہ تھا۔ خصوصاً شیخ ابوالرضا محمد اور شیخ عبدالرحیم نے تو علم و فضل میں بےنظیر شہرت حاصل کی۔

شیخ عبدالرحیمؒ

شیخ عبدالرحیم ۱۰۵۴ھ (۱۶۴۴ء) میں پیدا ہوئے۔ قرآنِ حکیم اور ابتدائی درسی تعلیم اور عقلی اور شرعی علوم اپنے بڑے بھائی شیخ ابوالرضا محمدؒ سے حاصل کیے۔ اس کے بعد مشہور حکیم میرزاہد ہروی کے آگے زانوئے تلمّذ تہ کیا اور علوم عقلی و نقلی میں بڑے بلند پائے پر پہنچے۔ خداشناسی میں آپ حافظ عبداللہ اکبرآبادیؒ کے مرید تھے، جو شیخ آدم بنوریؒ کے خلیفہ تھے۔

علمی کمال حاصل کرنے کے بعد آپ نے پرانی دلّی میں اس مقام پر ایک مدرسہ قائم کیا، جو اب مہندیوں کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا نام مدرسہ رحیمیہ ہوا اور لوگ دور دراز مقامات سے پڑھنے کے لیے آنے لگے +

شیخ عبدالرحیم بڑے زاہد اور متقی تھے اور کتاب و سنّت اور فقہ و تصوّف کے بہت بڑے عالم تھے۔ چنانچہ آپ بہت بلند پایہ حنفی فقیہ، نقشبندی صوفی، خدا رسیدہ حکیم اور الٰہیات کے ماہر تھے۔ ایک موقع پر آپ نے سلطان عالمگیر کے مشہور مجموعۂ قوانین — "فتاویٰ عالمگیری" — کی تالیف میں بھی حصہ لیا۔ لیکن دربار شاہی میں آنے جانے سے نفرت تھی۔ اس لیے اُسے ترک کر دیا آپ نے ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۸ء) میں وفات پائی +

امام ولی اللہ کی تعلیم و تربیت امام ولی اللہ شیخ عبدالرحیم کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ ۴ر شوال ۱۱۱۴ھ (مطابق ۱۰ر فروری ۱۷۰۳ء) کو پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے آپ کو علم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ چنانچہ فاضل باپ نے ہونہار بچے کی عمر کے پانچویں سال میں اُس کی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اُس نے سات سال کی عمر میں قرآن حکیم حفظ کر لیا اور ایک سال میں فارسی کی ابتدائی کتابیں نکال لیں اس کے بعد عربی کی تعلیم شروع ہوئی اور دس سال کی عمر میں اُس کی ابتدائی مشکلات پر بھی عبور حاصل کر لیا پھر عقلی اور دینی علوم شروع کیے اور ان عُلوم کا اُس زمانے میں جو نصابِ تعلیم تھا، وہ پندرہ سال کی عمر میں ختم کر لیا۔ جلیل القدر باپ نے اپنے قابل فرزند کو صرف درسی کتابیں ہی نہیں پڑھائیں، بلکہ حکمتِ عملی کی

تعلیم بھی دی، جو اُس زمانے میں بہت کم سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ حضرت امامؒ فرماتے ہیں کہ:

"حضرت ایشاں با اخلاقِ سلیمہ از شجاعت و فراست و کفایت و غیرت بوجہ اتمؒ موصوف بودند، و عقلِ معاش مثلِ عقلِ معاد کامل و وافر داشتند، در مجلسِ صحبت حکمتِ عملی و آدابِ معاملہ بسیارے آموختند۔" (جزءِ لطیف)

"یعنی جناب والد صاحب میں جہاں عمدہ اور پاکیزہ اخلاق، مثلاً بہادری، باریک سمجھ، کفایت شعاری اور غیرت، پورے اندازے پر موجود تھے، وہاں وہ خدا شناسی اور دنیاوی سمجھ بوجھ میں بھی بہت کامل تھے۔ چنانچہ آپ اپنی مجلس میں حکمتِ نظری اور معاملات کی بھی تعلیم دیا کرتے تھے۔"

تدریس امام ولی اللہ اپنے والد کی وفات تک مطالعے اور عبادت میں مشغول رہے۔ پھر ۱۱۳۱ھ میں مسندِ تدریس پر بیٹھے اور بارہ سال تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول اور دینی اور عقلی علوم نہایت تحقیق کے ساتھ پڑھاتے رہے۔ آپ نے اپنے زمانے کی ہندوستانی سوسائٹی کا مطالعہ نہایت گہری نظر سے کیا۔ خدا تعالیٰ نے آپ کا سینہ حقائقِ قرآن و سنّت اسرارِ شریعت اور مقاصدِ دین کے سمجھنے کے لیے کھول دیا۔

حج اور وفات ۱۱۴۳ھ میں آپ فریضۂ حج کی بجاآوری سے پہلے ہی حجاز پہنچ گئے اس سفر میں آپ حجاز کے بزرگوں سے ملے اور بعض سے آپ نے حدیث کی سند بھی حاصل کی ان

میں سے خاص طور پر قابلِ ذکر بزرگ شیخ ابو طاہر مدنیؒ ہیں، جو فرمایا کرتے تھے کہ "ولی اللہ مجھ سے لفظوں کی سند لیتے ہیں، میں اُن سے معنوں کی سند لیتا ہوں لہ"۔

دو سال تک حجاز میں علماء کی صحبت اُٹھانے کے بعد آپ ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ (۲۰ دسمبر ۱۷۳۲ء) کو جمعہ کے روز دہلی واپس پہنچے۔ بقیہ عمر تعلیم و تصنیف میں بسر کی اور تریسٹھ سال کی زندگی پا کر ۱۱۷۶ھ ہجری (۱۷۶۲ء) دہلی میں وفات پائی۔ اور "اُو بود امامِ اعظم دیں" تاریخِ وفات ہوئی۔ جس سے ۱۱۷۶ھ سن نکلتا ہے کہ۔

مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں کہ :-

"ابنِ تیمیہ اور ابنِ رُشد کے بعد بلکہ خود اُنہی کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزّل شروع ہؤا تھا، اُس کے لحاظ سے یہ اُمید نہ رہی تھی، کہ پھر کوئی صاحبِ دل و دماغ پیدا ہو گا لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھانا تھا کہ اخیر زمانے میں جب کہ اسلام کا نفسِ واپسیں تھا، شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہؤا، جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی، ابنِ رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔" (تاریخ علم الکلام)

لہ الیانع الجنی۔ کہ ا + و + ب + و + د | ا + م + ا + م | ا + ع + ظ + م | د + ی + ن

۱ + ۶ + ۲ + ۶ + ۴ | ۱ + ۴۰ + ۱ + ۴۰ | ۱ + ۷۰ + ۹۰۰ + ۴۰ | ۴ + ۱۰ + ۵۰

۱۹ + ۸۲ + ۱۰۱۱ + ۶۴ = ۱۱۷۶

نواب صدیق حسن خان لکھتے ہیں کہ:۔

"اگر وجود اُو در صدرِ اوّل و در زمانۂ ماضی مے بُود، امام الائمہ وتاج المجتہدین شمردہ مے شد۔"

یعنی اگر شاہ ولی اللہ تاریخِ اسلام کے پہلے دور میں ہوتے، تو امام الائمہ (اماموں کے امام)، اور مجتہدوں کے سرتاج شمار ہوتے"۔

اخلاق و عادات اور مسلک حضرت امامؒ نہایت متقی اور متواضع تھے۔ علماءِ طلبہ فقراء اور صالحین سے بہت محبت کرتے تھے اور ہر وقت تعلیم و تدریس اور مسلمانوں کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔

آپ کا مسلک اعتدال کا تھا اور مذہبی باتوں کی علمی اور عقلی توجیہہ پیش کرنے کی کوشش فرمایا کرتے تھے۔ ایسے ہی فقہ اور حدیث کو ملا کر دکھاتے تھے اور حدیث اور قرآن کو جمع کرتے تھے۔

اساتذہ آپ نے مندرجۂ ذیل اُستادوں اور بزرگوں سے دُنیاوی عُلوم اور خداشناسی کے طریقے سیکھے:۔

(۱) علامہ شیخ عبدالرحیم: حضرت امام کے والد ماجد تھے، زیادہ تر علوم انہی سے حاصل کیے۔ آپ ہی کی تعلیم و تربیت اور صحبت سے قرآنِ حکیم کو فلسفیانہ لغویات اور اسرائیلی روایات سے الگ کر کے تدبر کرنے اور اُسے سمجھنے کا ملکہ اور تحقیق کا ذوق پیدا ہوا۔

(۲) شیخ محمد افضل سیالکوٹیؒ: ان سے آپ نے حدیث حاصل کی۔ شیخ محمد افضلؒ نے شیخ عبداللہ بن سالم بصری المکی سے حاصل کی۔

(٣) **شیخ ابوطاہر الکردی المدنی** رح: یہ شیخ کبیر ابراہیم الکردی المدنی رح کے فرزند ارجمند تھے۔ حضرت امام رح نے ان سے صحیح بخاری اور دیگر کتب احادیث کی اطراف پڑھیں اور عقل و نقل اور کشف کے درمیان جمع کرنے کا ڈھنگ سیکھا۔

(٤) **شیخ وفد اللہ المکی** رح: یہ شیخ محمد سلیمان المغربی رح کے فرزند جلیل تھے۔ حضرت امام صاحب نے آپ سے مؤطا امام مالک رح پڑھی۔

(٥) **شیخ تاج الدین القلعی** رح: آپ مکۂ معظمہ کے رہنے والے تھے حضرت امام صاحب رح نے آپ سے صحیح بخاری کی اطراف سنیں اور مؤطا امام احمد کی کتاب الآثار اور "مسند" دارمی کا مطالعہ کیا۔

آپ کے شاگرد | یوں تو آپ کے شاگردوں کی تعداد شمار سے باہر ہے، لیکن بڑے شاگرد حسب ذیل ہیں:-

آپ کے چاروں نامور فرزند، یعنی شاہ عبدالعزیز رح، شاہ عبدالقادر رح، شاہ رفیع الدین رح اور شاہ عبدالغنی رح۔ ان کے علاوہ شیخ محمد عاشق دہلوی رح، شیخ محمد امین کشمیری رح، اور سید مرتضیٰ بلگرامی رح (جو بعد میں یمن کے ایک شہر میں مستقل سکونت اختیار کر لینے کی وجہ سے زبیدی کہلائے)، شیخ جار اللہ ابن عبدالرحیم لاہوری، شیخ محمد ابوسعید بریلوی رح (جو امیر المؤمنین سید احمد شہید رح کے نانا تھے)، شیخ رفیع الدین مراد آبادی رح، شیخ محمد بن ابوالفتح بلگرامی رح، شیخ محمد معین سندھی رح (جو شیخ محمد حیات سندھی اور شیخ محمد ہاشم سندھی کے شیخ تھے) اور بیہقی عصر قاضی ثناء اللہ المظہری پانی پتی رح۔

تصنیفات پر ایک نظر

قرآنِ حکیم کی خدمت

(۱) ترجمۂ قرآن | برعظیم پاک و ہند میں اسلامی سیاسی نظام کی شکست کے جو آثار حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ کو نظر آ رہے تھے اور اُن کا مسلمانوں کی معاشیات پر اور پھر اُن دونوں کا اخلاقِ عامّہ پر جو اثر پڑنے والا تھا، اُنہیں حضرت امامؒ نے خوب اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ وہ سمجھ چکے تھے، کہ اب یہ سیاسی نظام مُلوکیت کی شکل میں قائم نہیں رہ سکتا بلکہ مستقبل میں اِس کی شکل کچھ ایسی ہوگی، جس میں عوام کو عمل دخل حاصل ہوگا۔ ایسی حالت میں قرآنِ حکیم کو از سرِ نو برسرِ اقتدار لانے کے لیے ضروری تھا کہ اُسے عوام کی زبان میں منتقل کیا جاتا تاکہ وہ اپنے فیصلے سے اس کی تعلیمات اپنے معاشرے میں رائج کریں چنانچہ آپ نے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا جو اس زمانے میں مسلمانوں کی عمومی زبان (لنگوا فرینکا) تھی۔

اور اس کا نام فتح الرحمٰن رکھا۔ اس سلسلے میں آپ "فتح الرحمٰن" کے "مقدمے" میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"و مرتبۂ ایں کتاب بعدِ خواندنِ متنِ قرآن و رسائلِ مختصر فارسی ست تا فہمِ لسانِ فارسی بے تکلّف دست دہد و بتخصیص صبیانِ اہلِ حرفہ و سپاہیان کہ توقّعِ استیفاءِ علوم عربیہ ندارند، در اوّل سنِ تمیز ایں کتاب ایشاں را تعلیم باید کرد تا اوّل چیزے کہ در جوفِ ایشاں اُفتد معانیِ کتاب اللہ باشد۔" (مقدمۂ قلمی فتح الرحمٰن)

"یعنی متنِ قرآن کے بعد بچوں کو چند مختصر فارسی کتابیں پڑھا دی جائیں، تاکہ وہ فارسی زبان سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔ پھر یہ کتاب (فتح الرحمٰن) پڑھائی جائے۔ چونکہ اہلِ حرفہ اور سپاہیوں کے بچّوں کو عربی کی تعلیم پوری حاصل کرنے کی امید نہیں ہوتی، اس لیے یہ کتاب بچپن ہی میں پڑھا دینی چاہیے تاکہ سب سے پہلے جو چیز ان کے دماغ میں اُترے، وہ اللہ کی کتاب کے معنی ہی ہوں"۔

اس اقتباس میں "اہلِ حرفہ" اور "سپاہیان" کا تذکرہ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ یہ ان کے اقتصادی اور انقلابی افکار کی طرف اشارہ ہے۔

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ:۔

"منفعتِ آں در حقِ جمہورِ مسلماناں متوقع است، انشاء اللہ العظیم"
یعنی اللہ نے چاہا، تو اس سے عام مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

یہ قرآنِ حکیم کا پہلا ترجمہ ہے۔ جو اس برعظیم میں شائع ہوا اور اب تک بارہا چھپ چکا ہے۔ اسے اردو میں بھی منتقل کیا جا چکا ہے

(۲) مقدّمہ یہ بھی فارسی میں ہے۔ اس میں حضرت امام الملّت نے قرآنِ حکیم کے ترجمے کے اصول بیان فرمائے ہیں +

(۳) فوائد فتح الرحمٰن ترجمے اور مقدّمے کے علاوہ حضرت حکیم الملّت امام ولی اللہ نے قرآنِ حکیم پر حواشی بھی لکھے ہیں، جو بجائے خود نہایت مفید اور معنی خیز ہیں۔ ان حواشی میں حضرت حکیم الملّت نے بعض مقامات پر عام ترجموں سے اختلاف بھی کیا ہے اور اپنے مخصوص پروگرام کی دفعات جا بجا داخل کر دی ہیں +

مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا تبصرہ شارحِ حکمتِ ولی اللّٰہی حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ:-

"فتح الرحمٰن" قرآنِ حکیم کا صاف فارسی میں ترجمہ ہے۔ اس میں کوشش کی گئی ہے کہ قرآنِ حکیم کے الفاظ مختصر موزوں فارسی الفاظ میں ترجمہ ہو جائیں۔ ترجمے کی نزاکت پر اضافہ یہ ہے، کہ کہیں کہیں فوائد بھی لکھ دیے ہیں۔ جن سے قرآنِ عظیم کی یہ تفسیر، عام تفسیروں سے ممتاز ہو گئی ہے۔ مثلاً انبیاء کا سلاطین و ملوک سے جہاد کرنا تہذیب و شائستگی کو قانونی تشکل دینا عامۃ الانسانیت کے مسلّمات سے ہے چونکہ عام تفاسیرِ قرآنی اس زمانے میں لکھی گئی ہیں، جب اسلامی نظام برسرِ اقتدار تھا اور اُس زمانے میں بادشاہ اور امیر کی موجودگی

کی وجہ سے اس کی سرکردگی کے بغیر لڑنا متصوّر نہ تھا، اس لیے ان تفاسیر میں قرآنی واقعات کو ایسے انداز میں بیان کیا گیا ہے جس کا پڑھنے والے کے دل پر یہ اثر پڑتا ہے کہ گویا قرآنِ حکیم کا ماننے والا جب تک اپنے آپ کو کسی بادشاہ اور فوج کے ساتھ منسلک نہ کردے، اُس کا مخالفین سے لڑنا اور مقابلہ کرنا جائز نہیں۔ لیکن حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ اس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں، جب یہ نظام ٹوٹتا ہوا صاف نظر آرہا تھا، اس لیے اُنہیں سوچنا پڑا کہ جس زمانے میں سلاطین شکست کھاجائیں، کیا اُس زمانے میں قرآنی تعلیم معطّل ہوجائے گی؟ اس کا جواب حضرت امام "فتح الرحمٰن" کے حواشی میں دیتے ہیں۔ یعنی یہ کہ سلاطین اور جنگ کے بغیر بھی قرآن کی حکومت کا ایک درجہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ یہ محض اُس اجتماعی قوت سے ہوسکتا ہے، جو دعوت کے ذریعے سے تکمیل پاتی ہے۔ جس حاشیے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، وہ سورۂ رعد کے آخر میں مذکور ہے۔ اس ایک ہی نکتے سے یہ ترجمہ عام تفاسیر سے بلند تر درجہ پیدا کرلیتا ہے۔ حضرت امامؒ نے یہ بات "فیوض الحرمین" اور "قول الجمیل" میں بھی ذکر کی ہے۔ لیکن سب سے پہلے سورہ رعد کے آخری حصے کو سمجھ لینا ضروری ہے۔[1]

[1] آیت اولم یروا انا نأتی الارض ننقصها من اطرافها الآیہ

(باقی صفحہ ۱۲۱ پر)

اس قسم کے ضمنی فوائد "فتح الرحمٰن" میں بکثرت ملتے ہیں، لیکن اُن پر احاطہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ یہ درس میں داخل ہو۔

فتح الرحمٰن کی ایک ممتاز خصوصیت یہ بھی ہے، کہ عام مفسرین کی طرح اس میں ترجمۂ قرآن کے وقت ایک آیت کے متعلق مختلف احتمالات کو گوارا نہیں کیا گیا، بلکہ صرف ایک ہی ترجمہ کیا گیا، جو نحوی ترکیب کے اعتبار سے صحیح ہوسکتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ عام تفسیروں کے مطالعے سے طالب علم کے دل میں جو شکوک پیدا ہوجاتے ہیں "فتح الرحمٰن" وہ شکوک پیدا

(بقیہ صفحہ ۲ سے آگے) (دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آتے ہیں)، پر حاشیہ لکھتے ہوئے حضرت حکیم الملّت امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ:۔

یعنی روز بروز شوکتِ اسلام بہ زمین عرب منتشر مے شود و دار الحرب ناقص مے گردد از اطراف آں۔ عامہ مفسرین ایں آیت را مدنیہ دانند، نزدیک مترجم لازم نیست کہ مدنی باشد و مراد از نقصانِ دار الحرب، اسلامِ اسلم و غفار و جہنیہ و مزنیہ و قبائل یمن است، پیش از ہجرت (حاشیہ فتح الرحمٰن)

یعنی عرب کے ملک میں اسلام کی شوکت روز بروز زیادہ پھیلتی جاتی ہے اور دار الحرب ہر طرف سے کم ہوتا جاتا ہے۔

عام مفسرین اس آیت کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔ لیکن مترجم کے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ مدینہ میں نازل ہوئی ہو۔ دار الحرب کے کم ہونے سے مراد یہ ہے کہ اسلم، غفار، جہنیہ، مزنیہ قبیلے اور یمن کے قبیلے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے ہی اسلام لے آئے۔

ع۔ اس لیے اس میں دار الحرب کے کم ہونے سے مراد غزوات کے نتیجے کے طور پر دار الحرب کا کم ہونا ہے۔ لیکن حضرت امام رح کے نزدیک یہ خیال درست نہیں، بلکہ اس سے مراد دار الحرب کے کم ہونے کی وہ صورت ہے جو دعوت و تبلیغ سے مکی زندگی میں پیش آئی۔

ہونے نہیں دیتا" (از امالی حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ)

(۴) فوز الکبیر | قرآنِ حکیم کے ترجمے کے عظیم الشان انقلاب انگیز کام کے ساتھ ہی حضرت حکیم الہندؒ نے قرآنِ حکیم کی تفسیر کے اصول بھی مدوّن کیے اور اس طرح سے اس کتابِ عظیم کے سمجھنے میں جو فکری و ذہنی مشکلات تھیں وہ اس کتاب کے ذریعے سے دور کر دیں۔

اب تک تفسیر کا عام طریقہ یہ تھا کہ آیتوں کی تشریح میں ہر قسم کی صحیح اور کمزور روایتیں جمع کر دی جاتی تھیں، یا قرآنِ حکیم کے لفظوں کی باریک بینی کی جاتی تھی۔ کہیں کہیں حکمت کی باتیں بھی آجاتیں، لیکن بہت کم۔ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ نے قرآنِ حکیم کی تفسیر کے لیے اصول تجویز کیے اور اس پر ایک

ا؎ قرآنِ حکیم کے ترجمے کے متعلق دوسری دقت یہ پیدا ہوئی کہ امام صاحب کے زمانے میں تو دلّی کی درباری زبان فارسی تھی لیکن بعد کے زمانے میں فارسی نہ رہی، بلکہ اس کی جگہ اردو اور انگریزی نے لے لی۔ اس لیے ہم پھر ترجمے کے محتاج ہو گئے۔ اس حاجت روائی کے لیے ہم حضرت امامؒ کے فرزند جلیل شاہ عبد القادر دہلویؒ کے ترجمہ و حواشی — موضح القرآن — سے بہتر ترجمہ و حواشی پیش نہیں کر سکتے۔ "فتح الرحمن" کی طرح "موضح القرآن" میں بھی بے شمار فوائد مضمر ہیں۔ یہ حواشی غور سے پڑھے جائیں تو بہت سی آیتوں کے معانی عام تفاسیر کی بہ نسبت زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔

"موضح القرآن" میں دلّی کی جو زبان استعمال کی گئی ہے، وہ پرانی ہو گئی۔ اس لیے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے بڑی احتیاط سے اس کی اصلاح کر دی ہے۔ مگر حواشی کا درجہ ویسے ہی رہا۔ وہ اپنی جگہ بے نظیر ہیں۔

ہم "موضح القرآن" کو "فتح الرحمن" کا تتمہ مانتے ہیں۔ (امالی مولانا عبید اللہ سندھیؒ)

مستقل کتاب لکھی، جس کا نام "فوز الکبیر فی اصول التفسیر" ہے +

"فوز الکبیر" پر ایک نظر اس کتاب کے چار باب ہیں :-

بابِ اوّل: اس میں قرآنِ حکیم کے عُلوم کا بیان ہے۔ جنہیں حضرت امامؒ نے مندرجۂ ذیل پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے :-

(ا) **علمِ اَحکام**: اس ذیل میں فرماتے ہیں کہ قرآنِ حکیم کے اَحکام انسانی اجتماع کی بداخلاقیاں اور بداعمالیاں دُور کرنے کے لیے نازل ہوئے ہیں +

(ب) **علمِ مخاصمہ**: اس کے ذریعے قرآنِ حکیم نے یہودیوں، عیسائیوں، مشرکوں اور مُنافقوں پر حجّت تمام کی ہے۔ اس بحث میں آپ نے یہ بھی بتایا ہے، کہ آجکل بھی قرآن کے ماننے والی قوموں میں اکثر وہی باتیں پائی جاتی ہیں، جو رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں موجود تھیں۔ اس لیے قرآنِ حکیم اس زمانے کے لوگوں کو بھی اسی طرح تنبیہ کرتا ہے، جس طرح اُس زمانے کے "مسلمانوں" کو تنبیہ کی +

(ج) **علمِ تذکیر بآلآءِ اللہ**: اس باب میں قرآنِ حکیم اُن نعمتوں کا ذکر کرتا ہے، جو تمام لوگوں کے لیے یکساں نفع رساں ہیں اور جن سے خدا تعالیٰ کی ربوبیت ثابت ہوتی ہے حضرتِ امامؒ "سطعات" میں لکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اپنی نعمتیں بتانے کے لیے علم طبیعیات (Physics) وغیرہ کی طرف بھی اشارات کیے ہیں +

(د) **تذکیر بایّام اللہ**: اس باب میں قرآنِ حکیم مختلف قوموں کے عروج و زوال اور اُن کی تباہی و بربادی کی طرف اشارے کرتا ہے۔ یہ گویا تاریخِ اقوام

پر مشتمل ہے +

(۷) تذکیر بالموت وما بعد الموت: اس باب میں آنے والی زندگی کے حالات بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ وہ حالات انسان کی اس دنیاوی زندگی ہی کے نتیجے ہیں۔ امام ولی اللہ نے اپنی کتابوں میں اس کی مفصل تشریح کر کے مسلمانوں کو جمود سے بچا لیا +

باب دوم: اس باب میں بیان فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم سمجھنے میں کیا کیا دقتیں پیش آتی ہیں۔ پھر ان پر مفصل بحث کر کے اُن کے حل کی طرف بھی رہنمائی کی ہے۔ ان مشکلات کی ذیل میں ناسخ ومنسوخ پر بھی خوب لکھا ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں کہ "شیخ جلال الدین سیوطی رح نے کم از کم بیس آیات منسوخ بیان کی ہیں۔ لیکن مجھے ان میں سے اکثر میں کلام ہے"۔ اس کے بعد اُن آیات کی تشریح ایسی کرتے ہیں، کہ نسخ زائل ہو جاتا ہے۔ تاہم آپ صرف پانچ آیتوں کو منسوخ مانتے ہیں[۱]۔ اس سلسلے میں یہ بھی بیان کرتے ہیں۔ کہ

---

[۱] مولانا عبید اللہ سندھی رح نے ان پانچ آیتوں کی بھی امام ولی اللہ کے اصول پر ایسی تشریح کی ہے کہ ان میں نسخ نہیں رہتا چنانچہ مولانا سندھی رح رقمطراز ہیں کہ:۔

"ان پانچ آیات میں جو سب سے زیادہ مشکل ہے، ہم اُس کو یہاں بیان کر دیتے ہیں۔ قال الامام ولی اللہ۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ الآیہ قُلْتُ منسوخۃ بِاٰیۃ يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ وحدیث لا وصیۃ لوارث مُبِيْنٌ للنسخ (الفوز الکبیر ص۱۰) (باقی صفحہ ۵۰ پر)

قرآن حکیم کی آیات شان نزول کی پابند نہیں ہیں، بلکہ اُن کے معنی عام ہیں۔

باب سوم: اس باب میں قرآن حکیم کے نزول کی ترتیب اور کتابی شکل میں لائے جانے کی ترتیب کے فرق پر بحث کرتے ہیں اور اس کی وجوہات بیان فرماتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۲۴ سے آگے) اگر وارثوں کے ایسے حالات نہ ہوتے جن میں وہ غیر وارث بھی بن سکتے ہیں، تو اس کی توجیہہ ناممکن ہوتی۔ والدین خصوصاً ایسی حالت میں ہیں کہ وہ غیر وارث نہیں ہوتے۔ لہٰذا ان کے حق میں وصیت قطعی طور پر منسوخ ہونی چاہیے اور آیت مذکورہ بالا میں مکتوبہ وصیت والدین کے لیے ہے اس لیے شاہ صاحب نے اس آیت کو منسوخ جان لیا۔ مگر میرے شخصی حالات ایسے تھے، جن سے مجھے تنبّہ ہُوا۔ میری والدہ غیر مسلمہ میرے ساتھ تھی میں بیمار ہوا، تو مجھے اس کی فکر لاحق ہوئی، کہ اگر میں مرجاؤں، تو اس بیچاری کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ اس وقت اس کی جس قدر خاطر تواضع کی جاتی ہے، وہ میری وجہ سے ہے میرے مرتے ہی وہ محروم ہوجائے گی۔ اب مجھے وصیت کا مطلب سمجھ میں آیا، کہ اگر حالات ایسے درپیش ہوں، تو وصیت لازم ہے بنابریں كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ پر عمل کرنے کی ایک صورت نکل آئی۔ اس لیے اس کو منسوخ کہنے کی ضرورت نہیں، اطلاق کو تطبیق کی خاطر مقید بیشک کرلیجیے، یہ تو فقہ قرآنی کا بہت وسیع باب ہے۔

علیٰ ہذا القیاس باقی ماندہ چار آیتوں میں تطبیق بہت آسان ہے وہ اولیٰ، غیر اولیٰ اور عزیمت و رخصت پر عمل کرنے سے حل ہوجاتی ہیں۔ (شاہ ولی اللہ نمبر "الفرقان" بریلی ۱۹۴۱ء) (ص ۲۵۰)۔

باب چہارم: تفسیر کے مختلف فنون کے بارے میں ہے۔ اُس میں یہ بھی بتایا گیا ہے، کہ صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی بیان کردہ تفسیر اور اُن کے بعد آنے والے علما کی تفسیر میں کیا فرق ہے۔

اس باب کی آخری دو فصلوں میں امام صاحب نے وہ خاص باتیں بیان کی ہیں، جن پر اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ مطلع فرمایا۔

"فوزالکبیر" کا اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

(۵) فتح الخبیر: اس میں قرآنِ حکیم کے مشکل الفاظ کی نہایت معنی خیز تشریح کر دی ہے۔ یہ نہایت مفصل ہے۔ اسے "فوزالکبیر" کا جزو بنا دیا گیا ہے۔

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ:۔

"قرآنِ حکیم کو امام ولی اللہ کے طریقے پر سمجھنے کے لیے فتح الرحمٰن کے ساتھ فوزالکبیر کا مطالعہ لازم ہے۔ اس میں تو کسی کو تردّد ہو ہی نہیں سکتا، لیکن فوزالکبیر کے مباحث حجۃ اللہ البالغہ کو محققانہ طور پر پڑھنے کے بعد ہی سمجھ میں آتے ہیں۔ اس طرح فوزالکبیر کے ذریعے سے حجۃ اللہ البالغہ قرآنِ حکیم کی تفسیر میں داخل ہو جاتی ہے اور یہ میرے مطالعے کا بڑا اہم ستون ہے۔ مجھے قرآن اسی طرح سمجھ میں آیا۔ جو چیز میں حجۃ اللہ البالغہ میں سمجھا، وہی چیز قرآن کے ترجمے میں لے گیا۔ مَیں نے اس طریقے کو نہایت اطمینان بخش پایا۔ قرآنِ حکیم کے سمجھنے کے لیے فوزالکبیر اور حجۃ اللہ البالغہ کے بعد سب سے زیادہ ضروری کتاب تاویل الاحادیث ہے۔ لیکن تاویل الاحادیث کے مطالعے سے پہلے بدور بازغہ اور خیر کثیر کا پڑھ لینا اشد ضروری ہے۔ اس کے بعد تاویل الاحادیث

اچھی طرح سمجھ میں آئے گی۔" (امالی مولانا عبید اللہ سندھیؒ)

علمِ حدیث اور علمِ اسرارِ دین

اگرچہ برعظیم پاک و ہند میں شیخ عبدالحقؒ کے زمانے سے حدیث کا چرچا ہونے لگا تھا، لیکن اس کے حقیقی فروغ کا دور امام ولی اللہ دہلوی کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔

حضرتِ امامؒ نے اوّل تو مؤطاؒ کو حدیث کی تمام کتابوں پر ترجیح دی۔ دوسرے اس کی دو شرحیں لکھیں۔ عربی میں "المسوّٰی" اور فارسی میں "المصفیٰ"[۱]۔ یہ دونوں طبع ہو چکی ہیں، مگر ابھی ان کا اُردو میں ترجمہ نہیں ہُوا۔

اس کے علاوہ آپ نے بخاری شریف کے ابواب کے عنوانوں کی حکمت میں ایک رسالہ لکھا، جس کا نام "شرحِ تراجمِ ابوابِ بخاری" ہے۔ یہ حیدر آباد (دکن) میں طبع ہو چکا ہے۔

"حجۃ اللہ البالغہ"

لیکن اس سلسلے میں آپ کی معرکہ آرا کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" ہے، جو آپ کا شاہکار ہے۔ سارے اسلامی لٹریچر میں ایک بے نظیر چیز ہے۔ اس میں فلسفۂ تشریع یعنی علمِ اسرارِ دین پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس کے اصول وضع کیے ہیں۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔

جلدِ اوّل میں جو بڑے سائز کے ۱۹۸ صفحات پر مشتمل ہے، ۱۱۲ صفحے تک اپنے فلسفے کے بڑے

۱؎ مقدمہ المصفّٰی

بڑے اصول بیان کیے ہیں۔ شروع میں گیارہ صفحے کے دیباچے میں اس کتاب کی تصنیف کی ضرورت بتائی گئی ہے۔ اس کے بعد سات مبحث آتے ہیں:۔

مبحثِ اوّل میں اس امر پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ انسان کیوں اپنے افعال و اعمال کا جواب دِہ ہے اور اُس کے اعمال کے نتائج کس طرح نکلتے ہیں۔

مبحثِ دُوم میں انسان کی زندگی کے دونوں دَوروں (یعنی موت سے پہلے اور موت کے بعد کی زندگی) میں اُس کے اعمال کے نتائج پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مبحثِ سوم میں انسان کی موجودہ زندگی کی تمدنی ترقی کے مدارج اور اس کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔

مبحثِ چہارم میں اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ اُن اصولوں کے مطابق جو پہلے مبحثوں میں زیرِ بحث آچکے ہیں، سعادتِ انسانی کیا ہے؟

مبحثِ پنجم میں نیکی اور بدی کے اصولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مبحثِ ششم میں سیاستِ ملّی پر بحث کی گئی ہے۔

مبحثِ ہفتم میں دکھایا گیا ہے، کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے قانون کس طرح بنائے جاتے ہیں۔

اس کے بعد ۲۲ صفحات کے قریب ایک تتمّہ کے لیے مخصوص کر دیے گئے ہیں، جن میں اِسلامی اصولِ قانون سازی کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بعض نہایت دِلچسپ اور نادر تاریخی حقائق و انکشاف کیے گئے ہیں۔

جلد دوم ۹۰ ۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں اُن اصولوں پر جو جلد اوّل میں بیان کیے جا چکے ہیں، سارے معتبر ذخیرۂ حدیثِ نبویؐ کی تشریح کی گئی ہے اور بیچ بیچ میں جا بجا نادر اصول ونکات بیان کیے گئے ہیں +

برعظیم پاک وہند میں مولانا محمد جمال الدین مرحوم مدار المہام ریاست بھوپال کی کوشش اور حوصلہ افزائی سے مولوی محمد احسن صاحب نے نہایت تحقیق وتدقیق کے ساتھ مختلف نسخوں کا مقابلہ کر کے ایک عمدہ نسخہ ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں تیار کیا۔ جس میں مشکل الفاظ کی تشریح کے لیے جا بجا حاشیے بھی چڑھائے۔ یہ نسخہ پہلے اس برعظیم میں اور پھر مصر میں طبع ہوا۔ اس کے بعد مصر ہی میں اس کا ایک عمدہ ایڈیشن چھپا۔ یہ دوسرا ایڈیشن اب عام طور پر مل جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے اُسے اُردو میں ترجمہ کیا ہے لیکن جو ترجمے راقم الحروف کی نظر سے گزرے ہیں، وہ زبانِ اُردو اور ادائے مطالب کے لحاظ سے ناقص ہیں اور اس عظیم الشان کتاب کے شایانِ شان نہیں سمجھے جا سکتے +

عِلمِ فقہ کی خدمت

حضرت حکیم الملّت امام ولی اللہ دہلویؒ نے فقہ کی خدمت کے سلسلے میں بھی بہت کام کیا۔ حجۃ اللہ البالغہ اگرچہ بظاہر علم اسرارِ دین کی کتاب ہے، لیکن غور سے مطالعہ کیا جائے، تو فقہ کے باب میں بھی اس میں بہت سی مفید

باتیں موجود ہیں۔ چنانچہ قسمِ اوّل کے مندرجہ ذیل ابواب اس ذیل میں خاص مطالعے کے لائق ہیں :-

(۱) باب ضبط المبہم وتمیز المشکل

(۲) باب التیسیر

(۳) باب اسباب اختلاف الصحابۃ والتابعین فی الفروع

(۴) باب اسباب اختلاف مذاہب الفقہا

(۵) باب الفرق بین اہل الحدیث واصحاب الرای

(۶) باب حکایۃ حال الناس قبل المأۃ الرابعۃ وبعدہا

اس کے بعد قسم دُوم میں جا بجا فقہی مسائل پر نہایت دلنشیں بحثیں موجود ہیں جن میں حکیمانہ نکات بھی آگئے ہیں +

فقہ کے متعلق حضرتِ حکیم الملّت نے ایک مختصر رسالہ "انصاف فی سبب الاختلاف" بھی لکھا ہے، جس میں حضرت نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر پانچویں صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) تک حدیث کی کتابوں کی تصنیف و تالیف اور فقہ کے مختلف مسلکوں کے وجود میں آنے پر بحث کی ہے۔ یہ کتاب عربی میں ہے۔ اس کا اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے+

تصوّف کی خدمت

تصوّف کے موضوع پر بھی حضرت حکیم الملّت نے اپنی مخصوص طرز

پر بعض رسائل لکھے ہیں۔ اس ذیل میں آپ کے مندرجۂ ذیل رسائل بہت زیادہ شہرت حاصل کر چکے ہیں:۔

سطعات: یہ فارسی میں ہے اس میں تجلی الٰہی کے مسئلے پر نہایت سیر حاصل بحث ہے اس کا اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے، لیکن ابھی طبع نہیں ہوا۔

ہمعات: یہ بھی فارسی میں ہے۔ اس میں صوفیا کے مختلف طریقوں کا بیان ہے اور ان کی تاریخ دی گئی ہے۔ نیز فلسفۂ اخلاق پر دوانی وغیرہ کے طریقے سے ہٹ کر نئی طرز اور نئے اصول پر بحث کی گئی ہے۔

الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللّٰہ: یہ بھی فارسی میں ہے۔ اس کے حصۂ اوّل میں صوفیاء کے طریقوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

القول الجمیل فی بیان سواء السبیل: یہ عربی میں ہے۔ اس میں تصوّف کے ان طریقوں کا بیان ہے، جو اس برعظیم میں رائج ہیں۔ یہ متعدد بار طبع ہو چکا ہے اُردو ترجمہ بھی موجود ہے۔

الطافُ القدس: یہ بھی فارسی میں ہے۔ اِس میں تصوّف کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ یہ نہایت مفید رسالہ ہے، اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

اِن کے علاوہ "تفہیماتِ الٰہیہ" جلدِ اوّل اور جلد دوم میں بھی تصوّف کے جستہ جستہ مضامین آتے ہیں، جو اپنی جگہ بے حد مفید ہیں۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ:۔

"تجلی الٰہی کی تشریح سمجھنے کے لیے امام صاحب کا رسالہ "سطعات" کا پڑھنا لازم ہے اور ادراکِ انسانی کے تنوع کی حقیقت معلوم

کرنے کے لیے "الطاف القدس" کا مطالعہ ضروری ہے۔ اسلام میں فلسفۂ تاریخ سمجھنے کے لیے "ہمعات" کا مطالعہ کرنا چاہیے اور صوفیاء کے طریق کی تفصیل "انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ" (حصۂ اول) میں دیکھنی چاہیے شاہ صاحب نے اپنے والدِ ماجد سے جس طرح "طریقہ" حاصل کیا، اُس کی تفصیل "القول الجمیل" میں ملے گی۔ شاہ صاحب کے والد صاحب اور چچا شیخ ابوالرضا محمدؒ کے سوانح حیات جنہیں شاہ صاحب کے فلسفے اور تصوّف کی روح کہنا چاہیے "انفاس العارفین" میں مذکور ہیں"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ:۔

"حکمتِ ولی اللّٰہی میں یہ رسالے ابتدائی قاعدوں (Primers) کے طور پر پڑھائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد امام ولی اللہ کی حکمت شروع کی جاتی ہے"۔ (دیباچہ "ہمعات"، مطبوعہ بیت الحکمت لاہور)۔

تاریخ

کسی فلسفے اور مسلکِ فکر کے صحیح ہونے کا ثبوت اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا کہ اس کے ذریعے جو نظری نتائج نکالے جائیں، وہ خارج میں انسانی زندگی میں نظر آجائیں۔ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ نے جو فلسفہ مرتب کیا، اُس کے مطابق تاریخِ عالم پر بھی نظر ڈالی اور آئمۂ فکر یعنی انبیاء کرام کی تاریخ اس طرح لکھی ہے،

کہ وہ سب ایک سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتے ہیں اور اُن کی ترتیب میں ایک فطری سلسلۂ ارتقاء نظر آتا ہے۔ یہ بے نظیر بحث اُن کی تصنیف "تاویل الاحادیث" میں ہے، جو اصل میں تو عربی میں ہے، مگر جس کا اُردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے +

اس سلسلے کی سب سے ترقی یافتہ چیز قرآنِ حکیم کی تعلیم ہے، جو بین الاقوامی درجے کی ہے۔ اُس نے دنیا میں کیا کام کیا اور عمل میں آکر کیا شکل اختیار کی؟ اُس کی مفصّل تاریخ "ازالۃ الخفاء" میں مرتب کی گئی ہے، جو فارسی کی ایک ضخیم کتاب ہے یہ بھی مولوی جمال الدین مدارالمہام ریاست بھوپال کی کوشش اور مولوی محمد احسن کی تصحیح سے بریلی کے مطبع صدیقی سے طبع ہو کر شائع ہوئی۔ اس کا بھی اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے، مگر ابھی ایک عمدہ مستند ترجمے کی ضرورت باقی ہے +

فلسفہ

امام ولی اللہ دہلویؒ کا فلسفہ ایک مرتّب فلسفہ ہے جس کے تمام اجزاء نہایت سلیقے کے ساتھ مربوط ہیں اور ہر ایک جز دوسرے جز کے ساتھ کچھ اس طرح وابستہ ہے کہ اُسے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا فلسفہ ارتفاقات بھی ان کے مکمل فکر کی ایک کڑی ہے جس کے اوپر اور نیچے اور کڑیاں بھی ہیں +

امام صاحب کے سلسلۂ افکار پر جامع نظر ڈالی جائے تو اس میں سب سے اوپر اُن کی الٰہیات آتی ہے اس کے بعد مثالیات، اس کے نیچے مادیات اور سب سے آخر میں معادیات آتی ہے اور اس طرح سے یہ چکر پورا ہو جاتا ہے:۔

الٰہیات: امام صاحب کی الٰہیات میں خدا تعالیٰ کی ذات و صفات اور اسماء و تجلیات سے بحث ہوتی ہے۔ وہ اس عالم میں وجود کا منبع ایک ہی مانتے ہیں یعنی ذاتِ الٰہی۔ وہ وجود اقصیٰ ہے جس میں سے تمام وجود بطور تنزلات پیدا ہوتے ہیں یعنی سب سے اوپر وجود باری ہے، جس نے اس عالم کو وجود بخشا جسے عالمِ ملکوت یا کلیتہً غیر مادی عالم کہتے ہیں۔ اس کا ایک نچلا درجہ عالم مثال ہے یہ ایک قوت ہے جو اللہ تعالیٰ کی قوتِ رحمانیہ سے پیدا ہوتی ہے اس کا ایک رخ عالمِ روحانی کی طرف ہے اور دوسرا رخ عالمِ مادی (عالمِ شہادی) کی طرف ہے۔ ان کی تحقیقات یہ ہے کہ مادہ اصل میں قوتِ مثالیہ سے پیدا ہوتا ہے اور مادہ پھٹ کر قوتِ مثالیہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اس طرح مادّے کا تعلق قوتِ مثالیہ کے واسطے سے عالمِ روحانی اور خدا تعالیٰ کی قوتِ رحمانیہ کے واسطے سے ذات باری کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ اور یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ جو مادّے سے ماوراء ہے مادی کائنات میں کس طرح دخل دیتا ہے اور اس نظریّے سے یہ مشکل بھی حل ہو جاتی ہے کہ کائنات میں جو غیر مادی قوتیں ہیں مثلاً حرارت، روشنی، مقناطیس، بجلی وغیرہ وہ کس طرح مادّے کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اور مادّے پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔

اس عالم مثال ہی میں انسانیت کا ایک مجسمہ ہے جسے وہ امام نوع انسانی کہتے ہیں۔ تمام انسانوں کا تعلق اس امام نوع کے ساتھ ہے اور اس کے دماغ اور قلب پر اللہ تعالیٰ کی جو تجلیات پڑتی ہیں۔ وہ اس کی انسانیت کی رہنمائی کرتی ہیں اور تمام انسان مرنے کے بعد اس امام نوع کی طرف یعنی اللہ تعالیٰ کی تجلیات کی طرف جانے میں راحت پاتے ہیں، اس کی طرف نہ جانا عذابِ الٰہی ہے۔ کیمبرج کے مشہور فلسفی اور ہیئت دان ڈاکٹر فریڈ ہائل (Fred Hoyle) اپنی کتاب "حقیقت کائنات" "The Nature of Universe" میں لکھتے ہیں کہ:-

"میں یہ کہنا پسند کروں گا، کہ زندگی کا ارتقاء کچھ اس نہج پر ہے کہ ہم (انسانوں) میں سے ہر ایک کا جوہر جمع ہو کر ایک بہت بڑا وجود بن جاتا ہے، جو ہم سب پر اثر انداز ہوتا ہے میرے خیال میں مادی کائنات کا اس قسم کا انقلابی ارتقاء اس جمودی تصور سے کہیں بڑھ کر شاندار ہے جو عیسویت پیش کرتی ہے" (ص ۱۱۲)

انسان میں عقل و بصیرت اس امام نوع کے تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے اور اُسی کے تقاضے انسان میں اجتماعیت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

جب انسان مادی شکل میں روئے زمین پر ظاہر ہوا، تو اس میں عام حیوانی تقاضوں ـــــ بھوک، پیاس، حفاظت کی ضرورت، جذبۂ جنسی ـــــ

کے علاوہ امام نوعِ انسانی کے اثر سے اس میں اجتماع اور حبِ جمال کے تصورات پیدا ہوئے اور عقل کا جو ورثہ اسے امام نوعِ انسانی سے ملا اس نے انسان کی اپنی مادّی زندگی کی مشکلات دور کرنے کی طرف رہنمائی کی۔ چنانچہ اس نے آلات ایجاد کرنے شروع کیے اور اپنے اندر پیدا ہونے والے افکار کے اظہار کے لیے زبان ایجاد کی، رفتہ رفتہ شہر بسائے اور سیاسی نظام پیدا کیا۔ یہاں تک کہ بین الاقوامیت تک ترقّی کی اور اب کرۂ زمین پر بسنے والی نوعِ انسان کے لیے ایک مشترک نظام گھڑنے کی کوشش کر رہا ہے اس سلسلے میں قرآنِ حکیم اس کی مدد کے لیے موجود ہے، جس نے انسان کے نوعی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے زندگی کے اصول پیش کیے ہیں۔ ایک نہ ایک دن یہ نوعی تقاضے غالب آئیں گے اور ایک عالمگیر نظامِ سیاست واقتصادیات ابھر آئے گا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ انسان نے جو ارتفاقات ایجاد کیے ہیں، وہ سب اُس کی انسانیت کے تقاضے سے پیدا ہوتے ہیں اور یہی ارتفاقات ہیں جن کی تفصیل آئندہ ابواب میں دی جا رہی ہے۔

اس ارتفاقی زندگی کا تقاضا ہے کہ وہ انسانیت کے جذبے کے تحت اپنے اندر خاص اخلاق پیدا کرے جن کی ترقی اسے ایک خاص روحانی سطح پر اونچا اٹھاتی ہے اور اُسے عالمِ مثال کے بلند ترین درجوں کی مخلوق — ملائکہ — کے ساتھ ہمنوا بناتی ہے۔

خود انسان کی سنت پر امام ولی اللہ دہلویؒ کے افکار اُن کے اس مربوط

فلسفے کے ساتھ بالکل وابستہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ انسان کے مادی بدن کے اندر ایک مثالی (قوت مثالیہ کے مطابق) جسم ہے جسے نسمہ کہتے ہیں۔ ہمارے حواس اس نسمے کے اندر کام کرتے ہیں اور بدن پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ہمارے اخلاق و اعمال کے نتیجے اسی نسمی جسم کے اندر محفوظ رہتے ہیں۔ مرنے کے بعد ایک منزل آئے گی، جب مادی جسم ختم ہو کر ہم عالمِ مثال میں زندگی بسر کریں گے اور مادی بدن کے ساتھ ہم نے اپنے اعمال کے جو جوہر اپنے نسمے کے اندر جمع کیے ہیں وہ ہمارے لیے راحت یا عذاب کے رنگ میں ظاہر ہونگے۔ اس طرح مادی زندگی کا تعلق مرنے کے بعد کی زندگی کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے۔

یہ امام صاحبؒ کے فلسفے کا بہت ہی مختصر خلاصہ ہے۔ تفصیل کے لیے ان کی کتابوں کا مطالعہ اور ان کے افکار کا تقابل زمانہ حال کے حکماء کے ساتھ کرنا نہایت مفید ثابت ہوگا۔

امام ولی اللہ اور انقلاب

"محض لوٹ مار کرنے کے لیے مرنے کی تیاری کر لی جائے، تو اسے انقلاب نہیں کہتے۔ انقلاب کے لیے پہلے ایک امرِ حق متعیّن کرنا ضروری ہے۔ پھر اُسے کسی خطۂ زمین میں جاگیر کرنے کے لیے جدّ و جُہد کرنا لازم ہے۔ اس امرِ حق کو کسی جگہ قائم کرنے کے لیے جِدّ و جُہد میں جان و مال سب کچھ قربان کر دینے کا

نام انقلاب ہے"۔
(امالی مولانا عبید اللہ سندھی صدا۱۳۵)

قرآنِ حکیم کی پیروی میں امام ولی اللہ کی تعلیمات کا تمامتر رنگ انقلابی ہے۔ اگر انقلاب سے مراد یہ ہے، کہ کسی تحریک کا ایک نصب العین ہو، اس کے لیے لڑنے والی جماعت ہو اور اُس کا ایک نظام عمل (پروگرام) ہو، تو یہ سب چیزیں حضرت امام کی تعلیمات سے صاف طور پر سمجھ میں آجاتی ہیں[۱]۔

اُن کے نزدیک قُرانی اِنقلاب کا نصب العین قرآن حکیم کی یہ آیت ہے: هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (یعنی خداوند تعالیٰ نے اپنے رسول۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ کو ہدایت اور قانون دے کر اس لیے بھیجا ہے کہ وہ اسے تمام دینوں پر غالب کرے۔ خواہ مشرک لوگ اسے ناپسند ہی کیوں نہ کریں) (ازالۃ الخفاء مقصدِ اوّل صہ۳)

اس تعلیم کو غالب کرنے والی سوسائٹی عدمِ تشدّد کی پابندی سے پیدا ہوتی ہے، جسے حضرتِ امام "فیوض الحرمین" میں **خلافتِ باطنہ** قرار دیتے ہیں۔

لائحۂ عمل خود قرآنِ حکیم بیان کرتا ہے۔ جہاں کسی جزوی معاملے میں اس کتابِ عظیم سے یا اس پر عمل کرنے والے اوّلین انقلابیوں کے عمل سے جنہوں نے حجاز میں کام کیا، کوئی روشنی براہ راست نہ مل سکے، وہاں سوسائٹی

---

[۱] "انقلاب (Revolution) کی تعریف "ڈکشنری آو سوشیالوجی" از فیر چائلڈ میں دیکھئے۔

کے لیڈر خود مناسب راہِ عمل تلاش کریں گے۔

حضرت امام الملّت کی تصنیفات کے مطالعے سے اُن کی انقلابی تحریک کے مندرجہ ذیل اصول سمجھ میں آتے ہیں :۔

(۱) قرآنِ حکیم ایک بین الاقوامی نظام کا حامل ہے، جو انسانیتِ عامّہ کے لیے ایک مستقل اور مؤثر بالذّات حکمتِ عملی پیش کرتا ہے۔ اِس کے نفاذ کے لیے کسی خاص زمانے یا کسی خاص قوم یا زبان کی قید نہیں۔ جس زمانے میں کوئی قوم اس کے پیدا کردہ انقلاب سے روگردانی کر کے ارتجاع میں مبتلا ہو جائے، اُس زمانے میں کوئی جماعت قرآنِ حکیم کے اصول پر عمل کر کے انقلاب برپا کر سکتی ہے اور کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس انقلاب کی بہترین مثال وہ ہے، جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے تاریخِ اسلام کے پہلے پچاس سال میں قائم کی اور یہ ہمیشہ کے لیے قرآنی اصول پر انقلاب برپا کرنے والی جماعتوں کے لیے آفتابِ ہدایت کا کام دے گی۔

(۲) معاشی اونچ نیچ کسی اجتماعِ انسانی کی خرابی کا سب سے بڑا سبب ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سے ظلم اور اخلاقی گراوٹ (ظالم اور مظلوم دونوں میں) پیدا ہو جاتی ہے، اس حالت کی اصلاح کے لیے انقلاب آتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اونچ نیچ دُور ہو جاتی ہے۔ ہر شخص کی معاشی ضرورتیں پوری ہونے لگتی ہیں اور خدا پرستی کے لیے وقت اور فرصت مل جاتی ہے۔

حضرت حکیم الملّت امام ولی اللہ دہلویؒ ہمارے دَور میں قرآنی انقلاب

کے سب سے بڑے رہنما ہیں۔ چنانچہ وہ خود بھی مدعی ہیں کہ انہیں خدا تعالیٰ نے اس دورۂ حکمت (Scientific Age) کا امام مقرر کیا ہے[1]۔ آپ ارتجاعی نظام کو توڑ کر عادلانہ نظام قائم کرنا اور اس کے لیے ایک منظم جماعت تیار کرنا چاہتے ہیں[2]۔ آپ کے انقلابی نظریے کا عنوان فکُّ کلِّ نظام (ہر ایک بوسیدہ نظام کی بربادی) ہے۔ اس کے لیے آپ حسبِ ضرورت لڑنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ آپ اس انقلاب کا مرکز دہلی کو قرار دیتے ہیں[3]۔ چنانچہ جب برعظیم پاک و ہند میں انگریز کے پاؤں گڑ گئے، تو آپ کے فرزند جلیل حضرت امام عبدالعزیزؒ نے ہند کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دے دیا۔ اسلامی قانونی اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب ہر ایک مسلمان پر جہاد بالکل اس طرح فرض ہے، جس طرح نماز فرض ہے۔ اس کے بعد آپ نے تحریکِ جہاد کی تنظیم شروع کی جس کے سربراہ امیرالمومنین سید احمدؒ کو بنایا۔ اس طرح شاہ عبدالعزیزؒ کی پیدا کردہ جماعت نے ایک مرتبہ انقلاب کا نہایت شاندار نمونہ قائم کر کے دکھا دیا۔ مگر ناسازگار حالات اور ساتھیوں کی غلطیوں کی وجہ سے وہ نظامِ جہاد جلد ہی ٹوٹ گیا[4]۔ لیکن اُن کا فکر زندہ رہا۔ اس کے بعد جماعت اس فکر پر کام کرتی رہی جس کے لیڈر پہلے دور میں مولانا حاجی امداد اللہ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور دوسرے دور میں مولانا شیخ الہند محمود حسن دیوبندیؒ

---

[1] تفہیمات الٰہیہ، جلد دوم، صہ ۱۳۳ ۔ [2] تفہیماتِ الٰہیہ، جلد اوّل، صہ ۱۲۰

[3] حجۃ اللہ البالغۃ، جلد اوّل صہ ۵ ۔ [4] اس کا خاتمہ اُس معرکے پر ہوا جو ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں پیش آیا۔

اور ان کے شاگرد رشید مولانا عبید اللہ سندھیؒ تھے۔ مولانا سندھیؒ نے ۱۹۲۴ء میں آق سرائے (استنبول) سے تقسیم ہند کا جو پروگرام شائع کیا وہ آگے چل کر مملکت خداداد پاکستان کے وجود میں آنے کا سبب بنا اب اس مملکتِ خداداد کو عالمگیر اسلامی انقلاب کا مرکز بنانے کے لیے امام ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ کی روشنی میں کام کرنا ضروری ہے +

دُوسرا باب

بحثِ ارتقاقات

یعنی

انسان کی ثقافتی ترقّی کی منزلیں

ارتقاقات سے کیا مراد ہے؟ انسان اِس دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے، تو اُسے دو قسم کی دقتیں پیش آتی ہیں :-

(۱) وہ اپنے روزمرّہ کے کام میں بعض رکاوٹیں پاتا ہے۔ مثلاً کسی وزنی چیز کو ایک جگہ سے اُٹھا کر دُوسری جگہ لے جانے کی حاجت ہوتی ہے۔ کسی بھاری وزن کو اُوپر اُٹھانے کی ضرورت پڑتی ہے +

(۲)، زندگی کے مسئلوں پر غور کرتا ہے، تو اُسے بعض گتھیاں سلجھانی

پڑتی ہیں۔ مثلاً حیات کیا ہے؟ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ کیا اِنسان مر کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتا ہے؟ سوسائٹی کے نظام میں جو بگاڑ پیدا ہو گیا ہے، اُس کے کیا اسباب ہیں؟ وغیرہ وغیرہ +

عقلمند لوگوں نے اُن مشکلات کے آسان حل دریافت کیے ہیں اور دریافت کرتے رہتے ہیں۔ معاشی اور فکری مشکلات پر آسانی سے عُبور حاصل کر لینے کے اِن طریقوں کو اِرتِفَاقات یا مَرافِق کہتے ہیں +

ارتفاقات کی دو قسمیں | اِرتِفاق کا مادّہ رِفق ہے، جس کے معنی نرمی یا نرمی سے کام لینے کے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اِنسان کے فائدے کی جتنی چیزیں ہیں، وہ کائنات میں موجود تو ہیں، لیکن وہ انسان کے خود بخود کام نہیں آتیں۔ وہ گویا "سرکش" اور "باغی" ہیں۔ انسان اُنہیں رام کر کے ہی کام لیتا ہے۔ اسی طرح کائنات پر سوچ بچار کرنے کے سلسلے میں جو مشکلات سامنے آتی ہیں، وہ رفتہ رفتہ سوچنے ہی سے دُور ہوتی ہیں۔ اس طرح اِرتفاقات کی دو قسمیں بن گئی ہیں:-

(۱) ارتفاقاتِ مَعاشیّہ

(۲) ارتفاقاتِ اِلٰہیّہ +

ارتفاقاتِ مَعاشیّہ | انسان کو کھانے پینے، رہنے سہنے کے سلسلے میں مشکلات پیش آتی ہیں، اُن کے حل کے طریقوں کا نام اِرتفاقاتِ مَعاشِیّہ ہے +

عقلِ انسانی کا مقام | اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان اکثر حیوانات کی بہ نسبت

بہت کمزور ہے۔ چنانچہ ہاتھی اور شیر کی بدنی قوت، گھوڑے اور ہرن کی رفتار، کتّے کی سونگھنے کی قوت، باز کی دیکھنے کی طاقت اور زرافے کی سننے کی قوت، انسان کی ان قوتوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ اب سے چند لاکھ سال اُدھر کرۂ زمین پر دیوزاد قسم کے حیوانات پائے جاتے تھے۔ اُن کے مقابلے میں انسان اتنا چھوٹا تھا، جتنی انسان کے مقابلے میں چڑیا۔ بایں ہمہ وہ بڑے بڑے حیوانات فنا ہو گئے لیکن حضرتِ انسان اب تک نہ صرف زندہ ہے، بلکہ ہر زمانے کی موجود نسل کے بڑے بڑے جانوروں پر غالب رہا ہے اور بعض کو قابو میں لا کر کام بھی لیتا رہا ہے۔ چنانچہ وہ اب برما اور وسطی افریقہ میں ہاتھی سے، ہند اور دُوسرے ملکوں میں گھوڑے سے شمالی برفانی علاقوں میں رینڈیر سے، اور افریقہ اور عرب کے تپتے ہوئے صحراؤں میں اُونٹ سے نہایت آشتی سے کام لے رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں اُن حواس کے علاوہ، جن میں وہ دوسرے حیوانوں کا شریک ہے، ایک ملکی نُور بھی موجود ہے، جسے عقل کہتے ہیں یہ انسان کے ذہن کا ایک حصّہ ہے، جو انسان کی جسمانی کمیوں کو نہ صرف پورا کرتا ہے، بلکہ اُسے حیوانات تو حیوانات، کائنات کی ذی شان اشیا پر فوقیت دیتا ہے۔

آلات کا استعمال | انسان کی اس ذہنی برتری کا نتیجہ یہ ہے، کہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے سلسلے میں جہاں پہنچ کر حیوان ٹھہر جاتا ہے، انسان وہاں سے بھی آگے بڑھتا ہے چنانچہ عام حیوانوں کی طرح انسان بھی غذا کے لیے

بعض چیزوں کا محتاج ہے۔ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے اُس کی تخلیق سے پہلے پیدا کر رکھی ہیں اور اُن کی تخلیق میں انسان کا کوئی ہاتھ نہیں۔ مثلاً انسان پانی پیتا ہے اور پھل کھاتا ہے۔ ان کی پیدائش میں انسان کی عقل و حکمت اور محنت و صنعت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ لیکن جب انسان دیکھتا ہے کہ کسی چیز کو اپنی طبعی قوت سے حاصل نہیں کر سکتا، تو خدا تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی دوسری چیزوں کو اپنے مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ بناتا ہے۔ مثلاً وہ کسی درخت کی بلند شاخ پر ایک پھل لگا ہوا دیکھتا ہے، جس تک اُس کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا، وہ ڈھیلا اُٹھا کر مارتا ہے۔ پھل نیچے آ گرتا ہے اور وہ اُٹھا کر کھا لیتا ہے۔ یہ آلے کا استعمال ہے۔

پھر وہ کبھی ڈھیلا بھی نہیں پاتا۔ اب اُس کی عقل ایک اور طریق کی رہنمائی کرتی ہے۔ وہ کسی درخت کی ایک لمبی ٹہنی توڑ کر اس کا ایک سرا ہاتھ میں تھامتا اور دوسرا سرا پھل تک پہنچاتا ہے اور اس طرح اپنی طبعی قوت وہاں تک پہنچا کر پھل گرا لیتا ہے یہ بھی آلے کا استعمال ہے آلات کے استعمال میں انسان تمام حیوانات پر فائق ہے۔ اس میں انسان نے جہاں تک ترقی کی ہے اور کر سکتا ہے۔ حیوانات اس کا لاکھواں حصّہ بھی نہیں کر سکتے۔

انسان کی دو تعریفیں: شاہ رفیع الدینؒ کی تعریف | بعض حکماء نے انسان کی تعریف حیوانِ ناطق سے کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سوچ سمجھ سکتا ہے اور سوچ بچار کے نتائج فصیح کلام کے ذریعے سے ظاہر کر سکتا ہے

اسی سے علوم پیدا ہوتے ہیں۔حکماء کے ایک اور گروہ نے انسان کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ **حیوان جو آلات استعمال کرتا ہے**۔وہ کہتا ہے کہ:۔

"The heart of human culture.... is to be found in the invention and use of tools, that is, in artificial objective instruments." ("Sociology" by Ogburn & Nimkoff (3rd Edition) Houghton Mifflin Co. Boston U.S.A.–P 50)

[ثقافت انسانی کی بنیادی چیز یہ ہے کہ انسان نے اوزار یعنی آلات بنا کر اُن کا استعمال شروع کیا"]

تعجب کی بات ہے کہ شاہ رفیع الدینؒ ابن امام الائمہؒ امام ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی تصنیف "تکمیل الاذہان" میں انسان کی جامع تعریف یہ کی ہے: وَمَا یَتَفَکَّرُ وَیَصْنَعُ بِالْاٰلَاتِ اِنْسَانًا اَرْضِیًّا[1]

[یعنی جو سوچتا ہے اور آلات سے اشیا بناتا ہے، انسانِ ارضی ہے]

انسانی ضرورتیں ہر روز بڑھتی گئیں اور نئی نئی حاجتوں کے پورا کرنے کے نئے نئے آسان ڈھنگ دریافت ہوتے گئے اور آلات کا استعمال ترقی کرتا گیا اور آلات بھی بہتر سے بہتر بنتے گئے۔چنانچہ ہزاروں سال پہلے کی انسانی بستیاں کھودی گئیں، تو انسانی ہڈیوں اور پنجروں وغیرہ کے ساتھ

---

[1] "تکمیل الاذہان": باب ثالث (نسخۂ قلمی، کتب خانہ مدرسہ دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈا (ضلع حیدرآباد سندھ)

پتھر یا دھات کے آلات بھی دستیاب ہوئے ہیں، جن سے لوگ کام لیتے تھے۔ ان کھدائیوں میں ثابت ہوا کہ پہلے زمانے کے لوگوں کے مقابلے میں موجودہ زمانے کے لوگوں کے پاس زیادہ ترقی یافتہ آلات ہیں۔ اب تو انسان نے آلات کے استعمال میں بے انتہا ترقی کر لی ہے۔ عظیم الشان کلیں اور نہایت پیچیدہ اور نازک آلات بن گئے ہیں، جن کی مدد سے تھوڑی قوت و محنت اور تھوڑے مواد کے استعمال سے نہایت کم وقت میں بہت بڑے بڑے نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں +

اجتماع کا استعمال | انسان کا یہ خاصّہ بھی ہے کہ وہ اپنے ذہن میں ایسے کام کا نقشہ سوچتا ہے، جیسے پُل بنانا، پہاڑوں سے دھاتیں نکالنا یا سوسائٹی میں اچھی باتیں رائج کرنا۔ اگر وہ ایسی کسی بات کو اکیلا پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہے تو اُسے سیکڑوں برس لگ جائیں اور بے حد محنت کرنی پڑے۔ اِس لیے وہ دُوسروں کو بھی اس کام میں شریک کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ اس مقصد کے لیے سمجھ دار لوگوں سے بحث کرتا ہے۔ طرح طرح سے پروپیگنڈا کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا نظریہ زیادہ صاف اور عام طور پر قابلِ قبول ہو جاتا ہے اور لوگوں کا ایک گروہ اس کے ساتھ مل کر کام کرنے کو آمادہ ہو جاتا ہے اکثر لوگ اس نظریّے کی تکمیل کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے ہیں، اسے اِجتماع کہتے ہیں۔ یہ اجتماع کسی کام کو جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اُسی طرح مؤثّر ہوتا ہے، جس طرح مشین و آلات +

غرض دنیا کے بڑے بڑے عقلمند آدمی آلات اور اجتماع سے کام لے

کر تھوڑے وقت اور تھوڑی محنت و قوت کے صرف سے زیادہ نتائج حاصل کرنے کے طریق آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔ ان طریقوں کو ارتفاقاتِ مَعاشِیَّۃ[1] کہتے ہیں۔ حضرت امام ولی اللہ کے نزدیک انسان کی دنیاوی زندگی ان ارتفاقات ہی سے پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے (تفصیل آگے آئیگی)

ارتفاقاتِ الٰہیّہ لفظِ ارتفاق پر غور کیا جائے، تو یہ اس کی حقیقت کو بھی واضح کرتا ہے کہ انسان اپنے لیے کوئی چیز نیست سے ہست نہیں کر سکتا، بلکہ اپنی عقل اور محنت سے کام لے کر خدا تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو اپنے گرد جمع کرکے اُن سے مناسب کام لے سکتا ہے۔ وہ جوں جوں زیادہ مفید اور زیادہ باریک چیزیں سمجھتا جاتا ہے۔ اُس کے دل میں خود بخود یہ خیال آتا ہے کہ وہ اس قدرتی نظام کا راز معلوم کرے، جس میں وہ گھرا ہوا ہے۔ وہ اپنے ارد گرد بے شمار چیزیں پاتا ہے، وہ انہیں رام کرکے کام لینے کی کوشش کرتا ہے، تو ان سب کو ایک خاص نظام میں جکڑا ہوا پاتا ہے، مثلاً ٹھوس چیزیں اپنی شکلیں قائم رکھتی ہیں۔ ان کا حجم نہیں بدل سکتا۔ مائعات اپنا دباؤ خاص قاعدوں کے ماتحت چاروں طرف منتقل کرتے ہیں۔ حرارت سے مادہ پھیلتا ہے، جس کے خاص قوانین ہیں۔ غرض انسان یہ سب باتیں دیکھ کر سمجھتا ہے کہ اس نظام کا کوئی منبع ضرور ہے۔ چنانچہ سر برآوردۂ یورپ سر جیمز جینز

---

[1] دیکھئے "ڈکشنری آو سوشیالوجی از فیرچائلڈ"۔ "Artifacts" آرٹیکل "Artifacts"

(Sir James Jeans) ذہنِ انسانی پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"The universe can best be pictured although very imperfectly, as consisting of pure thought, thought of what, for want of a better word we must describe as a Mathematical Thinker."

(Outline of Modern Belief. Vol III - p 784)

[یعنی "اس کائنات کی دھندلی سی تصویر ان الفاظ میں کھینچی جا سکتی ہے کہ یہ کسی کے فکرِ خالص کی بنی ہوئی ہے۔ چونکہ اس کے لیے ہمیں کوئی بہتر لفظ نہیں ملتا، مجبوراً اُسے ریاضی دان مفکر کہنا پڑتا ہے"]

ایک قدم اور آگے بڑھا کر جینز (Jeans) کہتے ہیں کہ:۔

"The Universe has been designed by the Great Architect of Universe." (Ibid)

[یعنی: اس کائنات کا نقشہ معمارِ اعظم کائنات کا تجویز کردہ ہے]۔

زمانہ حال کے مشہور سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام اپنی تقاریر بہ سلسلہ "یادگار اقبال" (The Iqbal Memorial Lectures) میں کارخانہ قدرت میں یکسانیت اور موزونیت کے اظہار کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"If we have done any thing we hope we have shown that allied with the wonder of God's Creation, all explanation we have ever found is

based on Symmetry Concepts." (Symmetry Concepts in Modern Physics published by the Atomic Energy Centre Lahore (Pakistan) 1966)

[اگر ہم نے (ان تقاریر میں) کچھ کیا ہے، تو شاید ہم یہ واضح کر سکے ہیں کہ تخلیقِ الٰہی سے پیدا ہونے والے جذبہ تحیّر کے بدوش (معمہ کائنات) کا جو حل ہمیں دستیاب ہوتا ہے وہ (ان قوتوں کے) تناسب و موزونیت (Symmetry) کے تصورات پر مبنی ہے جو کائنات میں کام کر رہی ہیں]

غرض اعلیٰ دماغ والے لوگ کائنات کے نظام کو سمجھنے اور اپنے خیالات کو زیادہ صاف کرنے میں عمریں صرف کرتے رہے ہیں اور سوچ بچار کے نہایت قیمتی نتائج اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ انہیں اِرتقاقاتِ فکریہ یا ارتقاقاتِ الٰہیہ (Elements of non-material Culture) کہتے ہیں +

جس طرح آلات سے کام لینے سے محنت کم اور پیداوار زیادہ بڑھتی ہے، ویسے ہی ایک عمومی ارتقاقی جماعت میں کام کرنے سے فردِ انسانی کی قیمت بہت بڑھ جاتی ہے اور خداشناسی کا راستہ بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اگر معاشی ارتقاقات کی طرح ارتقاقاتِ الٰہیہ کا سلسلہ بھی انسانوں میں قائم نہ ہوتا، تو وہ کبھی بھی عقل کے مطابق اطمینان کے ساتھ خدا کو نہ مان سکتے اور وہ بے حساب ترقی سے محروم رہ جاتے۔ انسان اپنے معاشی ارتقاقات میں بصیرت

سے کام لے کر ترقی کرے، تو ارتفاقاتِ الٰہیہ کی وہ باتیں جو اُسے بڑے بڑے حکیموں کے کہنے پر ماننی پڑتی ہیں، خود اُس کے مشاہدات میں آجائیں گی اور وہ ارتفاقاتِ الٰہیہ کو بھی انسان کی اجتماعی ترقی کا بے حد ضروری حصّہ پائے گا۔

انسان کی فوقیت حیوانات پر۔ جس طرح حیوان کھانے پینے، نسل بڑھانے اور سردی گرمی اور مینہ دھوپ سے بچنے کے لیے مسکن بنانے کا محتاج ہے، اسی طرح انسان بھی ان باتوں کا محتاج ہے۔ ان باتوں کے سوچنے میں ہر ایک انسان کی شخصیت (Individuality) کام نہیں کرتی۔ اگر ایسا ہوتا، تو ہر ایک انسان اپنی اپنی ضرورتوں کا حل الگ الگ طریقے پر سوچتا اور ایک بات پر کوئی اجتماع پیدا نہ ہوسکتا۔ حقیقت یہ ہے، کہ سب انسانوں میں ایک قدرِ مشترک ہے اور وہ ہے انسانیت۔ وہی ہے، جو ایک ضرورت کا سب افراد سے کم و بیش ایک ہی جیسا حل کراتی ہے۔ اس مشترک جوہر کا نام نوعی تقاضا Specific Necessity) بھی ہے۔ یہ نوعی تقاضا ہمیشہ ایک ہی رہتا ہے اور ایک ہی رہے گا۔

امام ولی اللہ دہلویؒ انسان اور دوسرے حیوانات میں دو قسم کے فرق کی توضیح کرتے ہیں:۔

(۱) ظاہری اور

(۲) باطنی

(۱) ظاہری فرق تو یہ ہے کہ انسان سیدھا کھڑا ہوتا ہے۔ سوچ سمجھ کر باقاعدہ جملوں میں بات کر سکتا ہے۔ اُس کی جلد بالوں سے نسبتاً پاک ہے۔ اس کے مقابلے میں مثلاً گھوڑا ہے، جو سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا، بلکہ چاروں پاؤں پر جھکا ہوا ہے۔ وہ صرف ہنہنا سکتا ہے۔ انسان کی طرح کلام نہیں کر سکتا اور اس کی ساری جِلد پر بال ہیں۔ یہی حال دوسرے جانوروں کا ہے۔

(۲) باطنی فرق: انسان اور حیوانات میں اِدراک اور تلاشِ معاش کی طرف رہنمائی کے سلسلے میں بھی بہت فرق ہے۔ یہ دونوں باتیں انسان میں بہ نسبت دوسرے حیوانوں کے بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔

حیوانوں کو فطرت نے بعض باتیں سکھائی ہیں، جن کے مطابق وہ کام کرتے ہیں۔ مثلاً شہد کی مکھی کو جبلّی طور پر الہام ہوا کہ یوں پھول پھول اُڑ کر شہد جمع کرے۔ یوں مسدّس شکل کے گھروں کا چھتہ تیار کرے اور پھر سب مکھیاں مل کر رہیں اور ایک مَلکہ کے ماتحت کام کریں۔ بعض باہر سے شہد جمع کر کے لائیں۔ بعض چھتّے کے اندر رہ کر حفاظت کریں اور ملکہ کے "بچّوں" کی خدمت کریں۔ ایسے ہی چڑیا کو طبعی الہام ہوا کہ نر و مادہ مل کر کسی اُونچی جگہ گھونسلہ بنائیں۔ اس میں انڈے دیں اور پھر اُنہیں سیئیں۔ جب اُن کی مدّتِ معینہ ختم ہو جائے، تو اُن میں ٹھونگیں مار کر توڑ ڈالیں تاکہ بچّے باہر نکل آئیں۔ پھر ان بچوں کو چوگا دے کر پرورش کریں۔ یہاں تک کہ وہ خود اُڑ کر دانہ دُنکا چگنے کے قابل ہو جائیں

یہ طبعی الہام انہیں یہ بھی سکھاتا ہے کہ ایک حد تک افراد مل کر کام کریں اور نفع حاصل کریں یا ضرر سے بچیں۔ مثلاً ایک کوّے کو پکڑ لیا جائے، تو دُوسرے کوّے مل کر کائیں کائیں کرنے لگتے ہیں اور اپنے ساتھی کی خاطر لڑتے ہیں۔ حیوانات کو یہ سب باتیں اُن کی صورتِ نوعیہ (Specific Animal Form) سکھاتی ہیں، جس کا اصل منبع وہ حیوانی فطرت ہے، جس کا ایک مجسمہ بقول امام ولی اللہ عالمِ مثال میں موجود ہے۔

انسان تمام حیوانات سے نہایت نمایاں طور پر ممتاز ہے۔ مثلاً وہ سوچ کر بات کرتا ہے اور اپنے خیالات کو تحریر کے ذریعے سے ظاہر کر سکتا ہے۔ وہ اپنے عقلی تقاضے سے رفاہ عام کے کام کرتا ہے اور جو کام کرتا ہے، اس میں ذوقِ جمال (Aesthetic Taste) کا بھی خیال رکھتا ہے۔

یوں تو انسان بہت سی باتوں میں حیوانوں پر فوقیت رکھتا ہے، لیکن مجموعی طور پر غور کیا جائے، تو انہیں تین حصّوں (Categories) میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) رائے کلی (Public Weal) کا تصوّر: ایک حیوان جب کوئی حرکت کرتا ہے، تو وہ یا تو اپنے لیے کسی نفع حاصل کرنے کی خاطر کرتا ہے یا کسی ضرر سے بچنے کی غرض سے۔ وہ نفع یا تو اُس کے سامنے ہوتا ہے یا کچھ عرصے کے بعد حاصل ہونے والا ہوتا ہے۔ مثلاً وہ پانی پینا چاہتا ہے، تو اُٹھ کر پانی کے مقام پر جاتا ہے اور پانی پی لیتا ہے

بھوک لگتی ہے، تو گھاس وغیرہ چرلیتا ہے یا شکار مار کر کھالیتا ہے۔ بعض اوقات بعض حیوانات جیسے شہد کی مکھی، دیمک، چیونٹی وغیرہ آئندہ کے لیے بھی خوراک وغیرہ کا ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ لیکن انسان کی فطرت ان سے بلند تر ہے۔ وہ ایسے کام بھی کرتا ہے، جن سے اس کی ذات کو فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے (بلکہ خواہ نقصان پہنچے) لیکن اس کے ابنائے نوع کو فائدہ ضرور پہنچ سکتا ہے۔ مثلاً انسان شہر میں اچھا نظام قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے اس میں اُسے بہت تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے بایں ہمہ وہ کوشش کرتا ہے اور کبھی کبھی ایسے کام کرتا ہے، جن کا نتیجہ اُسے برسوں بعد ملتا ہے یا مرنے کے بعد ملنے کی توقع کرتا ہے۔ چنانچہ ہمارے جن شہداء نے ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں جانیں دیں اُن کی کوششیں تاریخ کے صفحات پر نقش ہو گئی ہیں۔ اس قسم کے کام کوئی حیوان نہیں کرتا اور نہ کر سکتا ہے۔

ایسے ہی حیوان اپنے اور اپنے بچوں کی حفاظت کی خاطر جان دے سکتا ہے، جیسے مرغی اپنے چوزوں کی حفاظت کرتی ہے۔ بندریا اپنے بچوں کی خاطر لڑتی ہے۔ لیکن کوئی حیوان یہ نہیں کر سکتا کہ کسی شہر یا ملک میں کوئی اچھا نظام قائم کرنے کی خاطر اپنی جان دے۔ جیسے پاکستان کے ہوابازوں، بحری فوج اور برّی فوج کے جوانوں نے ۱۹۶۵ء میں کر کے دکھایا۔

انسان اپنے اخلاق اور علم کی تکمیل کے لیے بھی کوشش کرتا ہے، جس سے اجتماعِ انسانی کو فائدہ پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ مگر کوئی حیوان ایسا نہیں کر سکتا۔

ایسے ہی انسان ایسے اعمال بھی کرتا ہے، جن سے اس کی عزت اور ہیبت دوسرے انسانوں کے دلوں میں بیٹھ جائے۔ یہ بھی کوئی حیوان نہیں کرتا۔

(۲) ذوقِ جمال (Aesthetic Taste) حیوان ایسا کھانا کھاتا ہے اور ایسا مسکن بنا کر رہتا ہے، جو اُس کی فقط ضرورت پوری کرتا ہے۔ مثلاً بیل گھاس چر لیتا ہے۔ شیر کسی بیل کو مار کر کچا ہی کھا جاتا ہے۔ چڑیاں تنکے جمع کر کے گھونسلے بنا لیتی ہیں اور بھیڑیے زمین کھود کر بھٹ بنا لیتے ہیں۔ مگر انسان صرف "گزارہ" نہیں کرتا، بلکہ وہ ہر بات میں لُطف اندوزی، صفائی اور لذّت کا بھی خیال رکھتا ہے چنانچہ وہ نفیس کھانے پکاتا ہے۔ عمدہ سے عمدہ مٹھائیاں بناتا ہے۔ پھر انہیں عمدہ پاک صاف برتنوں میں رکھ کر نفاست کے ساتھ "تناول فرماتا ہے"۔ وہ اپنے پہننے کے لیے نہایت عمدہ خوشرنگ پاکیزہ، خوش وضع لباس تیار کرتا ہے اور رہنے کے لیے نہایت خوبصورت، ہوادار، آرام بخش اور دلفریب مکان تعمیر کرتا ہے۔ پھر وہ اپنی حُبِ جمال کی تسکین کے لیے اُسے طرح طرح سے مزین کرتا ہے اور پائیں باغ لگا کر گل و ریحان کی خوشبو اور بلبل کے دلفریب نغموں سے لطف اندوز ہوتا ہے یہ باتیں انسان کے سوا کسی اور حیوان میں نہیں پائی جاتیں۔

(۳) مادّۂ ایجاد و تقلید: کسی حیوان کو کوئی ضرورت پیش آتی ہے، تو اُسے پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً اُسے پیاس لگتی ہے، تو وہ پانی کے مقام چلا جاتا ہے۔ لیکن اُسے کوئی غیر معمولی دِقت پیش آجائے،

تو وہ اُسے دُور نہیں کرسکتا۔ مثلاً اگر جوہڑ سوکھ گیا ہو اور وہاں پانی نہ ہو، تو وہ واپس چلا آئے گا اور پیاس کے مارے مرجائے گا۔ لیکن کنوّاں کھود کر پانی نہ نکال سکے گا۔ اس کے برخلاف انسان میں یہ مادّہ ہے کہ اُسے کوئی حاجت پیش آئے، تو اُسے پورا کرنے کی ہرطرح کوشش کرتا ہے اور کوئی ضرورت موجودہ اشیا سے حاصل نہ ہو، تو وہ نئی چیزیں ایجاد کرلیتا ہے۔

بعض انسان اتنے عقلمند تو نہیں ہوتے کہ خود کوئی طریقہ ایجاد کرلیں لیکن وہ اتنا ضرور کرسکتے ہیں کہ کوئی شخص ایجاد کرے، تو اُسے بخوبی استعمال میں لاسکتے ہیں۔ مثلاً انسانی زندگی کے ابتدائی دَور میں کسی انسان کو بھوک یا پیاس لگی۔ اُسے کوئی چیز نہ ملی، جس سے وہ اپنی بھوک پیاس دُور کرتا۔ فرض کیجیے کہ کسی بہت عقلمند آدمی کو بھی اشتہا ہوئی، تو اُس نے غذا والا اناج دریافت کرلیا اور رفتہ رفتہ اناج اُگانے، آبیاری کرنے اور گاہنے وغیرہ کے طریقے ایجاد کرلیے اور یہ بھی دریافت کرلیا کہ ان دانوں کو کس طرح محفوظ کرلیا جائے۔ تاکہ پھر جب ضرورت پڑے، تو ان سے کام لیا جاسکے۔

ایسے ہی کسی حکیم نے چشموں اور دریاؤں سے دُور مقامات میں کوئیں کھود کر پانی نکالنے کا طریقہ سوچ لیا اور ضرورت کے وقت پانی محفوظ رکھنے کے لیے گھڑا، مٹکا، مشکیزہ، چھاگل وغیرہ ایجاد کرلی اور ان سے کم عقل لوگوں نے اُنہیں تقلید کے طور پر استعمال کرنا شروع کردیا۔ اسی پر

انسان کی دوسری چیزوں کا قیاس کر لینا چاہیے۔

انسان کی مجبوریاں اسی طرح رفتہ رفتہ اجتماعاتِ انسانی میں یہ الہامی علوم جن کی تجربے نے تائید کی جمع ہوتے گئے۔ اب یہ ارتفاقات انسانی اجتماعات میں اس کثرت سے رائج ہو گئے ہیں، کہ لوگوں کی زندگی کا جزو بن گئے ہیں اور کوئی انسانی اجتماع ان کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ چونکہ انسانوں کے مدارج، عقل و فہم کے لحاظ سے مختلف ہیں اور آب و ہوا اور زمین کی ساخت ہر جگہ یکساں نہیں ہے۔ اس لیے یہ ارتفاقات ہر سوسائٹی میں یکساں درجے پر نہیں پائے جا سکتے۔ اس اختلاف کے تین سبب ہو سکتے ہیں:-

(۱) تمام انسانوں کے مزاج یکساں نہیں ہیں، اس لیے ایک ہی ارتفاق مختلف مزاج کے لوگوں میں مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ جیسے کھانا کہ میدانی علاقے کے لوگ دال وغیرہ اُگا کر کھاتے ہیں۔ جنگلوں میں بسنے والے پھل کھاتے ہیں اور ساحلِ بحر کے پاس رہنے والے مچھلی کھاتے ہیں۔

(۲) تمام انسانوں میں عقل یکساں نہیں ہے۔ کسی میں عقل کم ہے اور کسی میں زیادہ۔ جن لوگوں میں عقل زیادہ ہے، وہ اپنے ارتفاقات بہتر بنا لیتے ہیں۔ اس برعظیم ہی میں بھیل اور گونڈ لوگوں کے کھانے کا طریقہ دوسرے لوگوں سے کم درجے کا ہے۔ یہ کم مہذب لوگ نیم پختہ گوشت ہاتھوں سے نوچ کر اور دانتوں سے توڑ کر کھا جاتے ہیں۔ مگر دوسرے مہذب لوگ اچھی طرح مسالے ڈال کر پکاتے ہیں اور باقاعدہ طشتریوں میں ڈال کر شائستگی کے ساتھ کھاتے ہیں۔

(۳) غور و فکر کی فراغت بھی کسی کو کم میسّر آتی ہے، کسی کو زیادہ۔ ایک ہی خاندان کی دو شاخیں ہوں۔ جن میں سے ایک نسبتاً زیادہ مالدار ہو، تو اس کے لوگ دوسری شاخ کے لوگوں سے ارتفاقی زندگی میں بہتر ہوتے ہیں۔ کیونکہ غریب لوگوں کو سوچنے کے لیے زیادہ وقت نہیں ملتا اور وہ اتنی فرصت ہی نہیں پاتے کہ اپنے ارتفاقات کی اصلاح کر سکیں۔ جیسی چیزیں میسر آتی ہیں، استعمال کر لیتے ہیں۔ ان میں لباس کے فیشن کم ہوتے ہیں اور کھانے پینے کے تکلفات بھی اتنے نہیں ہوتے، جتنے فارغ البال لوگوں میں ہوتے ہیں۔

ارتفاقات کے چار درجے

امام ولی اللہؒ کی تحقیقات کے مطابق مذکورہ بالا اصول کے لحاظ سے انسان نے اپنی معاشی ارتقائی زندگی میں مندرجہ ذیل منزلوں میں سے گزر کر ترقی کی ہے:۔

(۱) میدانی، کوہی، جنگلی، صحرائی اور برفانی علاقوں کے دہات کے چھوٹے چھوٹے اجتماعات پیدا ہوئے۔ یہ بستیاں دُور دُور ہوتی تھیں اور مختلف بستیوں کے باشندوں کا آپس میں میل جول بہت کم ہوتا تھا۔ اس لیے وہ آپس میں اپنے افکار اور تجارب کے اول بدل نہ کر سکتے تھے۔ ایسی حالت میں انسان جس منزلِ ارتفاقات میں سے گزرا، اُسے ارتفاقات کی منزلِ اوّل کہنا چاہیے۔

اس منزل میں انسان نے پہلے تو شکار کے ذریعے پیٹ پالنا سیکھا۔ پھر رفتہ رفتہ کاشتکاری کی طرف ترقی کی۔ وہ کھانا پکا کر کھانے لگا اور بول چال کی زبان پیدا کر لی۔ اس کے علاوہ یہ تصور پیدا ہو گیا کہ ہر ایک

مرد کے لیے ایک زوجہ معین ہو جس میں کوئی دوسرا مرد شریک نہ ہو۔

(۲) جب انسان کی آبادی بڑھی اور اس نے معتدل آب وہوا کے میدانی علاقوں میں بڑی بڑی بستیاں بسانی شروع کیں، تو ان بڑی بستیوں میں آبادی کی کثرت ہونے کے سبب سے زیادہ لوگوں کے ساتھ تعلقات پیدا ہو گئے۔ جس کے سبب سے افکار و مشاہدات اور تجربات کا آپس میں کثرت سے مبادلہ ہونے لگا۔ ان آبادیوں میں ایک ہی ارتفاق پر بہت جگہ تجربے ہونے لگے اور بہت سے سوچنے والے ایک ہی بات کو زیادہ سے زیادہ اچھی شکل دینے کے طریقے سوچنے لگے۔ مثلاً بہت سے عقلمندوں نے رات کو روشنی پیدا کرنے کے طریقوں پر غور کیا، تو مختلف درجوں کی سہولت کے ساتھ روشنی کی جانے لگی۔ رفتہ رفتہ سب سے سہل طریقہ پھیل گیا۔ ایسے ہی کھانے پینے، پہننے اور گھر بنانے کے متعلق مختلف تجربے کیے جانے لگے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ سہولت کے ساتھ اچھے سے اچھے نتائج حاصل کیے جائیں اور اچھے سے اچھے طریقے اس اجتماع میں پھیلتے گئے۔ اس طرح جب انسانوں نے ارتفاقِ اوّل کے جبلّی علوم پر حُسنِ جمال، رائے کلّی اور اپنے تجربات کی روشنی میں زیادہ غور کیا، تو ارتفاقِ اوّل کی باتوں میں زیادہ صفائی، عمدگی اور سہولت پیدا ہوتی گئی اور ارتفاق اول کے اعمال زیادہ بہتر طریقے سے سرانجام دیے جانے لگے انسانی شائستگی کے اس ترقی یافتہ درجے کو ارتفاق دوم کہتے ہیں۔ مگر بقول امام ولی اللہ انسان ارتفاق دوم میں اسی وقت ترقی کر سکتا ہے، جب وہ بھوک پیاس اور تسکینِ

جذبۂ جنسی سے فارغ ہو اور ارتفاقِ اوّل کی دوسری چیزیں، جو انسان کے لیے طبعاً ضروری ہیں، اُسے حاصل ہوں +

اس سے ظاہر ہے، کہ حضرت امامؒ کے نزدیک خوراک، پانی، لباس، مکان، صحت اور حصولِ علم کے ذرائع انسان کی طبعی ابتدائی ضرورتیں ہیں۔ جن کے حاصل ہونے کے بعد ہی کوئی اجتماع ترقی کر کے ارتفاقِ دوم میں قدم رکھ سکتا ہے +

امام صاحبؒ کے نزدیک جب انسان اپنی طبعی ابتدائی ضرورتیں حاصل کر لیتا ہے، تو اجتماعی زندگی کی اصلاح کے تجربے کرتا ہے اور ارتفاقِ اوّل کی چیزوں کو زیادہ صفائی اور عمدگی کے ساتھ استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح وہ ارتفاقِ دوم میں ترقّی کرتا ہے، جسے وہ مندرجہ ذیل پانچ شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں:-

(ا) حکمتِ معاشیہ (Organisation of Livelihood) یہ اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب کھانے پینے، لباس، مسکن اور نشست و برخاست اور کلام وغیرہ پر انسانی، اجتماعی تجربات وغیرہ کی روشنی پڑتی ہے اور حُبِّ جمال اثر انداز ہوتی ہے +

(ب) حکمتِ اکتسابیہ (Organisation of Proffession) یہ اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب بعض لوگ اپنی اپنی استعداد اور حالات و اسباب کے مطابق کسی خاص پیشے میں مہارتِ تامہ پیدا کر لیتے ہیں۔ مثلاً کوئی کپڑا بُننے کا ماہر بن جاتا ہے۔ کوئی اناج پیدا کرنا اپنا مخصوص پیشہ بنا لیتا ہے۔ اور کوئی فنِ تعمیر میں کمال پیدا کر لیتا ہے۔ اس طرح معاشرہ انسانی میں پیشہ وارانہ تقسیم

پیدا ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے بعض لوگ اپنے اپنے مخصوص کاموں میں پوری پوری مہارت حاصل کر لیتے ہیں +

(ج) حکمتِ منزلیہ (Organisation of Household) یہ گھر بنا کر بیوی بچوں سمیت رہنے، اس میں سیاست جاری کرنے اور اقربا اور دوستوں کے ساتھ حسنِ معاشرت سے پیش آنے سے پیدا ہوتی ہے +

(د) حکمتِ تعاملیہ (Organisation of Business.) جب لوگ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں، تو لین دین اور خرید و فروخت کرنے، اُدھار لینے دینے اور رہن وغیرہ کرنے کی حاجت ہوتی ہے۔ اس باہمی معاملت سے حکمتِ تعاملیہ پیدا ہوتی ہے +

(ہ) حکمتِ تعاونیہ (Co-operation) جب انسانی اجتماع وسیع ہو جاتا ہے اور آپس میں ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے، تو کفالت، مشترکہ کاروبار، وکالت، مزدوروں سے کام لینے وغیرہ کے سلسلے میں حکمتِ تعاونیہ کے اصول پیدا ہوتے ہیں +

(۳) جب مذکورۂ بالا اصول پر معاشرۂ انسانی ترقی کرنے لگا، تو لامحالہ لوگ شہر بسا کر رہنے لگے۔ مگر بقول امام ولی اللہ دہلویؒ شہر سے مراد فصیل بازار اور عمارات نہیں ہوتیں بلکہ شہری زندگی سے مراد ایک خاص قسم کا رشتہ، ربط اور باہمی تعلق ہے، جو بہت سے خاندانوں اور جماعتوں کے ایک جگہ رہنے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ ارتفاقِ دوم کے جو اصول اُوپر بیان کیے جا چکے ہیں، ان سے اس قسم کا ارتباط پیدا ہو جانا

---

[1] بدور بازغہ صفحہ

انسانی معاشرے کے لیے طبعی چیز ہے۔ اس طرح تمام جماعتوں میں باہمی تعاونات (Co-operation) اور معاملات (Bargaining) کے سبب سے ایک معنوی وحدت پیدا ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے شہر ایک "شخص" (Person) بن جاتا ہے۔ شخصِ انسانی کی طرح یہ "شخص" — شہر — بھی کبھی تندرست ہوتا ہے، کبھی بیمار اور جس طرح انسان کبھی داخلی اسباب سے بیمار پڑ جاتا ہے۔ جیسے زہریلی چیز کھا لینے سے صحت خراب ہو جاتی ہے کبھی بیرونی اسباب سے صحت بگڑ جاتی ہے جیسے چوٹ لگنے سے کوئی عضو خراب ہو جاتا ہے یا ہمارے بدن کی صحت پر برا اثر پڑتا ہے ایسے ہی شہر کی "صحت" بھی کبھی داخلی اسباب سے خراب ہو جاتی ہے۔ جیسے باشندوں میں لین دین کی خرابی پیدا ہو جانے سے دوسروں کا مال چرانے یا لوٹنے سے، کبھی بیرونی اسباب سے شہر کی حالت بگڑ جاتی ہے، جیسے کسی غنیم کے حملہ کرنے سے۔ ان دونوں حالتوں میں شہر کی صحت قائم رکھنے یا درست کرنے کے لیے ضروری ہے کہ شہری نظم و نسق کا کوئی نظام پیدا کیا جائے، تاکہ جو لوگ ارتفاقاتِ صالحہ کو بگاڑیں، انہیں روکا جائے اور سزا دی جائے۔ اس قسم کے نظام قائم کرنے کے لیے ٹیکس لگانے اور ان کے جمع اور خرچ کرنے کا اہتمام بھی کرنا ہوتا ہے[1]+

شہری زندگی کی اس حالت کو ارتفاقِ سوم کہتے ہیں+

(۴) جب مختلف معاشراتِ انسانی میں ایک ایک کی حکومت ارتفاقِ سوم کی بنیادوں پر مستحکم ہو گئی اور ان میں زر و مال جمع ہو گیا اور فوجی نظام بھی

---

[1] بدور بازغہ صد۱

مکمل ہوگیا، تو ان معاشرات یا اقوام کے درمیان جھگڑے، فسادات، عداوتیں، لڑائیاں اور جنگیں شروع ہوگئیں۔ اب ضرورت پڑی کہ ان جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے ایک بین الاقوامی نظام پیدا کیا جائے۔ اِسے ارتفاق چہارم کہتے ہیں۔ اس قسم کے بین الاقوامی اجتماعات کا نوع انسان میں پیدا ہو جانا بھی انسان کی طبعی ضرورت ہے +

ان درجوں کا باہمی ربط الغرض انسان کا ارتفاقِ اوّل حقیقت میں ارتفاق بہائمی یعنی حیوانی زندگی کے طور طریقوں پر مبنی ہے۔ جس میں صفائی اور عمدگی پیدا ہونے سے انسانی ارتفاق اوّل پیدا ہوگیا +

جب ارتفاقِ اوّل کی ضرورتیں پوری ہونے لگیں، تو انسان نے اس منزل سے ترقی کر کے ارتفاقِ دُوُم میں قدم رکھا۔ یہ گویا قبائلی یا ابتدائی شہری منزل ہے +

ارتفاقِ دُوُم میں ترقی ہونے سے ارتفاقِ سُوم یا ترقی یافتہ شہری زندگی پیدا ہوئی۔ یہ قومی زندگی ہے +

ارتفاقِ سُوم کی اقوام کے میل ملاپ سے ارتفاق چہارم پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہ منزل (یعنی صحیح بین الاقوامی زندگی) ہے، جس کی طرف انسانی سوسائٹی رفتہ رفتہ ترقی کر رہی ہے +

تاریخ کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب تک کبھی چنگیز خاں اور نپولین جیسے افراد کے غلبے سے بین الاقوامی اجتماعات پیدا ہوتے رہے ہیں، جن کی بنیاد استبداد (Despotism) پر تھی۔ کبھی فاروقِ اعظمؓ اور عثمان غنی رضؓ جیسے بزرگوں نے بین الاقوامی اجتماعات پیدا کیے، جن کی بنیاد خدمتِ انسانیت

اور عدل پر تھی۔ اب قوموں کا میل ملاپ اس حد تک ترقی کر گیا ہے، کہ آزاد اقوام بین الاقوامی اجتماعات میں مل بیٹھنے پر مجبور ہو رہی ہیں۔ اس میل ملاپ کی کامیابی بھی عدل ہی پر موقوف ہے۔ امام ولی اللہ کے نزدیک اس آخری رجحان کی تکمیل بھی انسانیت کی ایک طبعی ضرورت ہے، جو اپنے وقت پر پوری ہو کر رہے گی ؛

ان ارتفاقات یا حیاتِ انسانی کے مدارج اربعہ کی تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں ؛

تیسرا باب

ارتفاقِ اوّل

یعنی

ثقافت کی پہلی منزل: دیہاتی زندگی

انسان کی قوتِ ایجاد کا عمل ہم یہ دکھا چکے ہیں کہ حیوانات کی زندگی اور انسان کی بنیادی زندگی میں اصولاً کوئی فرق نہیں ہے، یعنی کھانے، پینے، گرمی سردی سے بچنے اور نسل بڑھانے کے جذبے میں انسان اور حیوان دونوں ایک سطح پر ہیں۔ لیکن انسان کو قدرت نے جو جوہرِ عقل عطا کیا ہے، وہ ان حیوانی ضرورتوں یعنی بہیمی ارتفاقات (Elements of Animal Culture) کو ایک مخصوص رنگ و شکل دے دیتا ہے۔ امام ولی اللہ دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ اور

"بدور بازغہ" میں یہ مسئلہ تفصیل سے بیان کیا ہے، کہ جب انسان عقلِ خداداد کی مدد سے حیوانات سے اُوپر اُٹھا، تو اُس نے سب سے پہلے اپنی کھانے پینے کی ضرورتیں حاصل کر کے اُن میں کچھ اصلاح کی کوشش کی۔ چنانچہ اس نے غذائی اناج تلاش کیے اور تجربوں سے معلوم کر لیا، کہ فلاں فلاں قسم کے اناج اُس کی طبیعت کے موافق ہیں۔ پھر اُس نے ان اناجوں کو کثرت سے حاصل کرنے کی ترکیبیں سوچیں۔ اس معاملے میں اُس کی عقل نے رہنمائی کی اور کارخانۂ قدرت میں جس طرح پودے اُگ کر اپنی نسل بڑھاتے ہیں، اسی طرح انسان نے کاشت کا طریقہ مکمل کیا۔ اُس نے خدا جانے کتنی صدیوں کے تجربوں کے بعد اناج بونے، اُس کی آب یاری کرنے، فصل کاٹنے اور اناج کو بھوسے سے الگ کر کے محفوظ کرنے کے طریقے معلوم کیے +

کھانے پینے کے متعلق

اِس کے ساتھ ہی اُس نے یہ اناج کھانے اور جزوِ بدن بنانے کے ایسے طریقے ایجاد کیے، جو حیوانوں کے طریقوں سے کہیں بہتر تھے، حیوان صرف کچی جنسوں پر گزارہ کرتا ہے یا دوسرے حیوانات کا کچا گوشت کھاتا ہے، لیکن انسان کی قوتِ اختراع نے اسے سالن کی طرف رہنمائی کی اور اُس نے دودھ، دہی، چربی اور دوسری غذاؤں کو اچھی سے اچھی شکل میں استعمال کرنے کے طریقے معلوم کیے۔ ایسے ہی اُس نے پودوں کی جڑوں سے غذائی کام لینا شروع کیا +

اِنسان نے پیاس بجھانے کے لیے پانی کی خاصیت معلوم کی اور پھر کنوئیں کھود کر پانی حاصل کرنے کا طریقہ ایجاد کیا اور ضرورت کے وقت

کام میں لانے کے لیے محفوظ کرنے کے واسطے گھڑے، مٹکے، مشکیزے، چھاگلیں وغیرہ بنائیں۔

زبان: انسان نے اپنے اس دَور میں ایک اور بہت بڑا کام کیا، جس سے وہ حیوانات سے بہت آگے نکل گیا۔ یہ زبان کی ایجاد ہے[1]۔

حیوانات اپنے جذبات کا اظہار مختلف آوازوں سے کرتے ہیں۔ مثلاً کسی حیوان کی ایک قسم کی آواز اُس کے درد کا اظہار کرتی ہے۔ دوسری آواز محبت کا۔ چنانچہ اگر کتّے کی دُم پر پاؤں پڑ جائے، تو وہ ایک خاص قسم کی آواز نکالتا ہے، لیکن جب اُسے غضب کے اظہار کی ضرورت پڑتی ہے، تو اُس کا لہجہ بالکل دُوسرا ہوتا ہے۔ اسی پر دوسرے جانوروں کا قیاس کر لینا چاہیے۔ لیکن انسان نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ آوازوں کو کاٹ کر حرفوں (Symbols) میں تقسیم کیا اور پھر حرفوں (Symbols) کو جوڑ کر نئے الفاظ بنائے اور اُن کے ذریعے سے اپنے خیالات اور جذبات ظاہر کرنے لگا۔

فطرت نے انسان کو ایسی طبیعت دی ہے، کہ وہ اُس کی صورتِ ذہنیہ کی ترجمانی کر سکتی ہے۔ یعنی اُس کے ذہن میں جو جذبات و خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اُن کے حسبِ حال آواز نکال سکتا ہے۔

---

[1] اوگبرن اور نمکاف (Ogburn & Nimkoff) اپنی مشہور تصنیف "Sociology" (طبع سوم ہاؤٹن مفلن کمپنی، بوسٹن) میں لکھتے ہیں کہ:-
"انسان کی ثقافتی ترقی کا ایک نیا اہم واقعہ یہ تھا کہ انسان زبان بولنے اور سمجھنے لگا۔ اس واقعے نے انسان کی ثقافت کو چار چاند لگا دیے اور وہ عام حیوانات سے بہت اونچا اٹھ گیا۔" (ص ۵۶)

انسان آنکھوں سے دیکھتا ہے اور کانوں سے سنتا ہے۔ ان دونوں ذریعوں سے باہر کی دنیا کی جو تصویریں اُس کے دماغ میں پہنچتی ہیں، اُن کی ترکیب و تحلیل سے وہ نئے نئے نتیجے نکال لیتا ہے۔ یہ صفت کسی اَور حیوان میں نہیں ہے۔ پھر وہ ان دماغی نتیجوں کو خاص خاص مفرد اور مرکّب آوازوں کے ذریعے سے ادا کر لیتا ہے۔ یہ بات بھی کسی دوسرے حیوان میں نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ انسان آوازوں کو جوڑ کر "الفاظ" بناتا ہے اور ان سے مختلف ذہنی صورتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ جسے دوسرے انسان سمجھ کر اُن کے جواب میں اسی قسم کے جوابی "الفاظ" استعمال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں انسان کے اس کمال کی داد دینی چاہیے، کہ وہ سوال و جواب کر سکتا ہے۔ یعنی ایک انسان سے کوئی معلومات حاصل کرنا چاہے، تو معین آوازوں کے ذریعے سے حاصل کر سکتا ہے۔ یہ بات کسی دُوسرے حیوان میں نہیں پائی جاتی +

حیوانات کی تسخیر ارتقاقِ اوّل میں انسان نے دُوسرے حیوانات کو مسخّر کر کے ان سے کام لینا شروع کر دیا اور اس طرح اپنی مشقّت میں بہت کمی کر لی۔ مثلاً زمین جوتنا، دُور دراز مقامات پر پہنچنا اور بوجھ پہنچانا۔ دُودھ، گوشت، کھال اَور اُون وغیرہ حاصل کر کے کام میں لانا +

مسکن اسی ارتقاق کی ایک ایجاد مسکن بنانا ہے۔ حیوانات گھونسلوں اور بھٹوں میں رہتے ہیں۔ وہ اُن سے آگے ترقی نہیں کر سکتے، مگر انسان کی عقلِ خداداد نے پہلے اسے مٹی کے گھروندوں میں رہنے کی طرف رہنمائی کی اور وہ بہت جلد خیمے اور گھر بنا کر اور فلک بوس عمارات تعمیر کر کے رہنے لگا +

لباس | ایسے ہی اس منزلِ ارتفاق میں انسان نے لباس کا استعمال شروع کیا، جس سے نہ صرف یہ کہ گرمی اور سردی سے اُس کے بدن کی حفاظت ہوئی، بلکہ عُریانی کو چھپانے کے نفسیاتی جذبے کی تسکین بھی ہوئی ۔

تعیینِ منکوحہ | اسی منزل میں ایک چیز یہ بھی ہوئی، کہ انسان نے اپنے لیے ایک زوجۂ منکوحہ معیّن کرنے کا طریقہ وضع کیا، تاکہ جذبۂ جنسی کی تسکین ہو اور نسل بڑھے۔ کوئی غیر انسان سوچ سمجھ کر اپنے لیے "منکوحہ" معیّن نہیں کرتا۔ ان میں جو نر و مادہ مل بیٹھتے ہیں، تو اس کے خارجی اسباب ہوتے ہیں۔ جن میں غیرت اور انانیت کا جذبہ اُس ترقی یافتہ شکل میں کارفرما نہیں ہوتا، جس شکل میں انسان میں ہوتا ہے ۔

بہترین اجتماع | غرض انسان نے تہذیب و تمدّن کی اس منزل میں اپنی حیوانی ضرورتوں کو انسانی عقل و دانش کی روشنی میں طبعی تقاضوں کے مطابق پورا کرنا شروع کر دیا۔ یہ حیوانی ضرورتیں اُس کے لیے دائمی ہیں۔ یعنی کوئی انسانی فرد یا اجتماع ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان فطری ضرورتوں کو پورا کرنا ہر ایک انسانی اجتماع کے لیے ضروری ہے اور بہترین اجتماع وہ ہے، جس میں ہر فرد کی یہ ضرورتیں بہترین طریق سے پوری ہوتی ہوں۔ امام ولی اللہ دہلویؒ اجتماعِ انسانی کی ان ضرورتوں کو پوری پوری اہمیّت دیتے ہیں اور جیسے آئندہ صفحات میں دکھایا جائے گا، ان ضرورتوں کے پورا نہ ہونے کو کسی سوسائٹی میں انقلاب کا ایک بہت مؤثر سبب قرار دیتے ہیں ۔

چوتھا باب

ارتفاقِ دوم

یعنی

ثقافت کی دوسری منزل: قصباتی زندگی

انسانیت کا اثر ارتفاقات پر جب انسانی اجتماع میں ارتفاقِ اوّل کی ضرورتیں پوری ہونے لگتی ہیں، تو عقلمند لوگ اُن ضرورتوں کے متعلق طرح طرح کے مزید تجربے کرنے لگتے ہیں اور اُن تجربوں کے نتیجے کے طور پر وہ ارتفاقات اختیار کرنے لگتے ہیں، جن میں زیادہ سے زیادہ نفع اور کم سے کم ضرر ہو اور جن میں زیادہ خوبصورتی اور نفاست پائی جاتی ہو۔ چنانچہ ارتفاق کی ابتدائی منزل میں انسان نے مختلف غذائی اناج دریافت کیے۔ اس کے بعد اُنہیں کھانے کے مختلف طریقے وضع کیے۔ پھر تجربے کرتے کرتے ایسے طریقے ایجاد کیے اور کھانے کی ایسی چیزیں دریافت کیں، جن میں غذائیت زیادہ ہو اور کھانا

زیادہ لذیذ ہو۔

ایسے ہی ارتفاقِ اوّل کے امور کو اخلاقِ فاضلہ کے مطابق جانچا جانے لگا اور جو طریقے زیادہ شائستہ نظر آئے، وہ اختیار کیے گئے۔ مثلاً روٹی ہاتھ میں بھی رکھ کر کھائی جا سکتی ہے اور کسی صاف ستھری چیز پر رکھ کر بھی۔ لیکن عقلمندوں نے اس دوسرے طریقے کو پہلے طریقے پر ترجیح دی اور دسترخوان پر رکھ کر کھانے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ طریقہ رواج پا گیا۔

ایسے ہی ارتفاقِ اوّل کے طریقوں کو حسنِ معاشرت اور رفاہِ عمومی کے اصول کے مطابق جانچ کر دیکھا گیا اور جو طریقے انسانوں کی باہمی معاشرت میں زیادہ مفید ثابت ہوئے وہ اختیار کیے گئے۔ مثلاً مکان بنانے میں یہ خیال رکھا جانے لگا کہ ہمسائے کو تکلیف نہ ہو۔ ایسے ہی وہ طریقے پسند کیے گئے، جن سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ مثلاً حوضوں اور کنوؤں کی تعمیر۔ ارتفاق کے اس درجے کو ارتفاقِ دوم کہتے ہیں۔

ارتفاقِ دُوم کے ابواب | ارتفاقِ دُوم میں مندرجۂ ذیل امور پر بحث ہوگی:۔

(۱) حکمتِ معاشیہ (۲) حکمتِ منزلیہ

(۳) حکمتِ اکتسابیہ (۴) حکمتِ تعاملیہ

(۵) حکمتِ تعاونیہ

(۱) حکمتِ مُعاشیہ

جیسے ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، ارتفاقِ اوّل میں انسان کو عموماً مندرجۂ ذیل اُمور کی ضرورت پڑتی ہے :-

(ا) کھانا — (ز) چلنا پھرنا اور اُٹھنا بیٹھنا
(ب) پینا — (ح) تسکینِ جذبۂ جنسی
(ج) زیب و زینت — (ط) سونا
(د) لباس — (ی) مرض
(لا) مسکن — (یا) مصائب
(و) سفر — (یب) بول چال

ان امور پر عقلمندوں نے تجربے، اخلاقِ صالحہ، حسنِ معاشرت، اور رفاہِ عامہ کے اصول کے مطابق غور کر کے اُن کی اچھی سے اچھی شکلیں اختیار یا تجویز کیں اس طرح اجتماعِ انسانی ارتفاقِ دُوم میں داخل ہوگیا۔ بقول امام ولی اللہ دہلویؒ یہ ابتدائی شہری یا قصباتی زندگی ہے۔ جب اس میں ابھی بلدی نظام (Municipal Organisation) پیدا نہ ہوا تھا۔ لیکن لوگ باہم مل جُل کر رہتے تھے +

رفاہیت کے تین درجے | یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے، کہ انسان کو زندگی بسر کرنے کے لیے کسی نہ کسی غذا کی حاجت ہے اور لین دین کے لیے کسی نہ کسی قسم کے سکّے کی ضرورت ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کا نقد

کے ساتھ مُبادلہ (Exchange) ایک طبعی ضرورت ہے، جس کے بغیر چارہ نہیں - مثلاً روپے کے بدلے میں روپے کا سکّہ لینے کی کیا ضرورت ہے؛ لیکن لوگوں کے مزاج اور عادات کے اختلاف کے باعث ہوتا یہ ہے کہ بعض لوگ تو اِن ارتفاقی امور میں نہایت بلند درجے کے "تکلّف" سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً کھانے نہایت اعلیٰ درجے کے کھاتے ہیں، جن کی تیاری پر سیکڑوں روپیہ صرف ہوتا ہے - لباس ایسے پُرتکلّف پہنتے ہیں اور مکان ایسے عالیشان بناتے ہیں، جن پر کثیر رقم خرچ ہوتی ہے - یہ لوگ ایک ہی جنس کی چیزوں میں سے بہترین کا انتخاب کرتے ہیں +

اس بلند درجے کی زندگی کو رفاہیت بالغہ (Luxury) کہتے ہیں +

بعض لوگ ارتفاقات میں اتنے گرے ہوئے ہوتے ہیں - کہ اُن کا معیارِ زندگی حیوانات کی زندگی سے کچھ ہی اُونچا ہوتا ہے +

یہ لوگ رفاہیتِ ناقصہ (Barbarism) میں ہوتے ہیں +

معاشرے میں ان دونوں قسم کے لوگوں کی تعداد کم ہوتی ہے - اکثریت اُن لوگوں کی ہوتی ہے، جو رفاہیتِ متوسّط (Middle Standard) کے مالک ہوتے ہیں +

حکمتِ معاشی (Social Life) کا معیار یہ وسطی درجہ ہی بن سکتا ہے +

رفاہیتِ بالغہ کا نقصان | انسان کے لیے یہ بھی ضروری ہے، کہ اپنے حال کے مطابق ترفّہِ مُفرط یا رفاہیتِ بالغہ سے بچے - کیونکہ اس سے حاجات بڑھ

جاتی ہیں۔ اخراجات کی کثرت ہو جاتی ہے، جس سے تکلیف، رنج اور مال کی بربادی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ افلاس ہوتا ہے۔

حکمتِ معاشیہ کے اجزا اب ہم حکمتِ معاشیہ کے مختلف امور پر فرداً فرداً غور کرتے ہیں:۔

(۱) کھانا: ضروری ہے کہ انسان جو چیز کھائے، وہ خراب نہ ہو۔ خراب سے مراد یہ ہے، کہ اوسط درجے کی رفاہیت والے معتدل منطقہ کے سلیم الطبع لوگ اپنے تجربے، اخلاقِ صالحہ، اصولِ معاشرت اور رفاہِ عامّہ کے اصول کے مطابق اُسے بُرا قرار دیں۔ مثلاً بدبودار کھانا، مُردہ جانور کا گوشت، حشرات الارض، شکار کرنے والے درندوں کا گوشت اور ایسے جانوروں کا گوشت جن کا مزاج اعتدال پر نہ ہو اور جن کے اخلاقِ حیوانی میں بھی شدت ہو۔ جیسے سؤر، کتا وغیرہ۔

کھانے کے آداب جب کھانے کے لیے بیٹھے، تو پہلے ہاتھ دھولے، کُلّی کرلے اور ناک صاف کرلے۔ اس کے بعد دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھائے۔ زمین پر رکھ کر نہ کھائے اور اپنے سامنے سے کھائے۔ کھاتے وقت غضب اور سرعت کا اظہار نہ کرے اور نہ بڑے بڑے لُقمے لے کر کھائے۔ کیونکہ یہ حرص کی علامت ہے کھانا اُس وقت کھائے، جب واقعی اچھّی طرح بھوک لگی ہو اور کھاتے وقت ایسی باتوں سے پرہیز کرے، جو ساتھ کے کھانے والوں کو ناگوار گزریں۔

کھانے پینے کی چیزوں میں سے سب سے اچھّی وہ چیز ہے، جو

آسانی سے ہل سکے اور اچھی طرح ہضم ہو جائے +

کھانے پینے کے لیے چاندی سونے کے برتنوں کا استعمال رفاہیت بالغہ ہے اور زمین پر رکھ کر کھانا رفاہیتِ ناقصہ ہے۔ اس لیے دونوں سے پرہیز کرنا چاہیے +

(ب) پینا: پینے کی چیزوں میں نشہ آور چیزیں بدترین ہوتی ہیں کیونکہ ان سے عقل کو زوال آتا ہے - اخلاق بگڑتے ہیں۔ مال ضائع ہوتا ہے۔ خانہ داری اور شہری انتظام میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ ایسے ہی سڑا ہوا پانی بھی مضر ہوتا ہے۔ پیتے وقت برتن میں سانس نہیں چھوڑنی چاہیے، بلکہ اُسے الگ کر کے سانس لینی چاہیے، غٹا غٹ پانی پینے سے بعض اوقات دردِ جگر پیدا ہو جاتا ہے، اس لیے تین دفعہ کر کے پینا چاہیے کیونکہ جہاں یہ معدے کے لیے مفید ہے، وہاں اس میں وقار بھی پایا جاتا ہے +

(ج) نظافت: انسان کے لیے ضروری ہے کہ اپنے بدن اور لباس کو ہر قسم کی مَیل کُچیل سے پاک رکھے۔ ہفتے میں کم سے کم ایک مرتبہ سارے بدن کو خوب پاک صاف کرے۔ مسواک وغیرہ بھی استعمال کرتا رہے اور بدن پر جو نازیبا بال ہوں، اُن سے بھی بدن کو پاک کرتا رہے۔ ایسے ہی نجاساتِ معنویہ (Psychological Filth) سے جنہیں ہماری قوتِ وہم ناپاکی قرار دیتی ہے، اپنے آپ کو پاک کرے۔ جیسے جنابت کی حالت اور ڈھیلا لینے کی حالت +

(د) زینت: یہ مرد کے لیے ضروری ہے، تاکہ سوسائٹی میں اُسے معزز خیال کیا جائے۔ عورت کے لیے ایسی زینت مناسب ہے، جو اس کے شوہر

کو مرغوب ہو۔ مثلاً زیور اور دیگر آرائشیں۔ لیکن ان میں اوسط درجے کی رفاہیت اختیار کرنی چاہیے +

(۵) لباس: تمام لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے، کہ برہنگی شرمناک ہے۔ وحشی سے وحشی اقوام اپنی برہنگی کو چھپانے کے لیے کوئی نہ کوئی صورت اختیار کرتی ہیں۔ انسان برہنگی کے ابتدائی احساس کے بیدار ہوتے ہی لباس کا استعمال کرنے لگ گیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اب تمام اقوام عالم میں مسلّم ہو چکا ہے کہ بہترین لباس، وہ ہے، جو عام بدن کو چھپائے۔ رفاہیتِ بالغہ یعنی عیاشانہ تکلف سے پاک ہو اور اُس سے غرور، تکبر کا اظہار بھی نہ ہوتا ہو +

(۶) مسکن: مکان کا مقصد مکینوں کا سردی و گرمی سے بچاؤ اور جان و مال کی حفاظت ہے۔ اس سے انسان کی ضروریات زندگی آرام دہ طریق سے پوری ہونی چاہییں اور اس کی ساخت ایسی ہو کہ طبع سلیم کو ناگوار نہ گزرے۔ اور نہ زمانے کی اچھی رسوم کے خلاف ہو۔ اس لیے مکان کی تعمیر میں بے جا تکلّف اور عیّاشانہ بناوٹ سے کام نہ لیا جائے۔ بہترین مکان وہ ہے جس کا موادِ تعمیر آسانی سے مل جائے۔ مکان کافی کھلا ہوادار ہو اور اوسط درجے کا اُونچا ہو +

(۷) تسکینِ جذبۂ جنسی: اس کے لیے مرد اور عورت کا باہمی میل ملاپ ضروری ہے۔ لیکن انسانی غیرت اس بات کی متقاضی ہے، کہ یہ فعل پوشیدہ طور پر کیا جائے اور اس کا علانیہ ذکر نہ کیا جائے۔ مرد کی منکوحہ معیّن ہو اور

کوئی دُوسرا شخص اُس سے تعلّق نہ رکھے +

(ح) سفر: سفر حسب ضرورت کرنا چاہیے اور رفیق راہ ہو تو بہت اچھا ہے۔ اگر گھوڑے وغیرہ پر سفر کرے، تو جانور کی ضروریات کا بھی خیال رکھّے +

(ط، ی) مشی و قعود: چلتے وقت میانہ روی اختیار کرے۔ اطرافِ بدن مٹکا کر نہ چلے اَور غیر معمولی تیزی نہ دکھائے +

محفل جس میں انسان بیٹھے مفید ہونی چاہیے۔ بدترین نشست گاہ راستہ ہے، جہاں عورتوں کے حُسن پر نگاہ پڑ سکتی ہے اور تشویشِ خیال پیدا کرنے والی صورتیں دماغ میں جمع ہو جاتی ہیں۔ ایسے مقامات سے پرہیز واجب ہے +

(یا) سونا: انسان کو چاہیے کہ رات کو جلد سو جائے۔ سوتے وقت اپنے دماغ کو تشویشناک باتوں سے پاک کرے اور بلند خیالات اور کلام الٰہی کی آیات ذہن میں رکھ کر سوئے +

(یب) مرض: جب کوئی شخص بیمار ہو جائے، تو چاہیے۔ کہ وہ خداوند تعالیٰ سے لَو لگائے اَور مجرب اَدویہ استعمال کرے۔ اگر نفسیاتی علاج کی ضرورت ہو، تو اس سے بھی فائدہ اُٹھائے۔ مثلاً اسماءِ الٰہی اَور اُس کے کلام کی آیات کا استعمال۔ اسماء سے مراد وہ قوتیں ہیں، جو کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں اور اس کائنات کو باطنی طور پر تسخیر کیے ہوئے ہیں اَور آسمانی اور زمینی قوتیں آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ وہ مل کر ایک اکائی بن گئی ہیں۔ اس لیے اسماءِ الٰہی مادیات میں معنوی طور پر مؤثر ہوتے ہیں +

(یج) مصائب: مصیبت کے وقت انسان کو چاہیے کہ نہ تو جزع فزع

کرے۔ نہ حواس باختہ و خوفزدہ ہو۔ بلکہ اللہ پر بھروسہ رکھے اور مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرے۔
(ییل) **کلام:** بلیغ ہونا چاہیے۔ آواز اتنی بلند ہو کہ سننے والا بآسانی سن لے کلام سے کسی کو تکلیف نہ پہنچائے۔ غیبت اور چغلی سے قطعیۃً پرہیز کرنا چاہیے۔ کیونکہ ان سے فساد پیدا ہوتے ہیں۔

۲۔ انتظام خانہ داری

گھر کیا ہے؟ خدا تعالیٰ نے انسان کے لیے جو نوعی پروگرام بنایا ہے اس کے مطابق بچوں کو اپنے ماں باپ کا مطیع بنایا ہے، یہ اس لیے کہ ماں باپ اپنی سرپرستی، غلبے اور شفقت کے تحت ان کی پرورش کرتے ہیں اور اپنی رحم دلی اور مہربانی کے ساتھ ان پر حکم چلاتے ہیں وہ بچے ہی ہیں اور ماں باپ تجربے میں بڑھے ہوئے ہونے اور عقل میں مکمل ہونے اور زندگی کے سرد و گرم بہت چکھے ہوئے ہونے کے باعث اُن کے بزرگ ہیں...... اس نوعی پروگرام کے سبب سے نوع انسانی میں تین نظام پیدا ہو گئے: شادی، اولاد اور غلامی ہمارے نزدیک اس نظام کو گھر کہتے ہیں ورنہ گھر سے مراد دیواریں اور دروازے اور چھتیں نہیں ہیں (البدور البازغہ ص ۶۲)۔

حکمتِ منزلیہ سے مراد یہ ہے کہ گھر والوں اور دوستوں کے ساتھ جو گھر میں گاہے بگاہے آتے رہتے ہیں، ایسا سلوک کیا جائے، جو انسان کے اچھے اخلاق، مصلحتِ عامہ اور صحیح تجربات کے مطابق ہو۔ تاکہ معاشرۂ انسانی میں بہترین ربط و ارتباط پیدا ہو سکے۔

نکاح اللہ تعالیٰ نے انسان کو خانہ داری کے انتظام کے سلسلے میں طبعی طور پر سکھایا ہے کہ مرد اور عورت کس طرح آپس میں مل کر رہیں۔ مرد اور عورت کے اس باہمی تعاون ہی پر خانگی زندگی موقوف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام دنیا کی اقوام میں مرد اور عورت

کے باہمی تعاون نے ہمیشہ ایک ہی شکل اختیار کی ہے یعنی نکاح اس کی شکل یہ ہوتی کہ گواہوں کی موجودگی میں مرد اور عورت ایجاب و قبول کرتے ہیں، یعنی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنا تسلیم کرتے ہیں۔ گویا عورت وعدہ کرتی ہے، کہ اس معاہدے کے دوران میں وہ اس قسم کے تعلقات کسی اور مرد کے ساتھ قائم نہ کرے گی اور مرد اس کی حفاظت اور کفالت کا عہد کرتا ہے، اس طرح ایک خاندان کا آغاز ہوتا ہے، جو معاشرے کی اکائی ہے +

گواہوں کی موجودگی ایک تو اس معاہدے کو شہرت عام دیتی ہے اور دوسرے اس کے متعلق بعد میں کسی قسم کا جھگڑا پیدا ہو، تو اس معاہدے کی موجودگی کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے +

تعیینِ منکوحہ | انسان میں غیرت کا جذبہ بھی طبعی طور پر پایا جاتا ہے۔ یہ جذبہ تقاضا کرتا ہے کہ اُس کی زوجہ کے ساتھ اُس کے سوا اور کسی کا تعلق نہ رہے، بلکہ وہ اسی کے لیے مخصوص رہے۔ اگر کوئی شخص ان کے تعلقات میں دخل دیتا ہے اور اُس کی بیوی کے ساتھ وہ تعلقات قائم کر لیتا ہے، جو اصلی خاوند کے ہیں، تو نہ صرف خانگی زندگی تباہ ہو جاتی ہے، بلکہ ان میں آپس میں قتل و غارت کی نوبت آجاتی ہے، جس سے شہری زندگی پر بھی بُرا اثر پڑتا ہے +

پردے کی ضرورت | ایسے ہی مرد کا جذبۂ غیرت گوارا نہیں کرتا، کہ کوئی شخص اس کی بیٹی یا بہن کے ساتھ ناجائز تعلق پیدا کرے +

ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ ہوا، کہ انسان نے اپنی بیوی، بیٹی اور بہن کو نگاہِ غیر سے محفوظ کرنے کے طریقے سوچے اور رفتہ رفتہ پردہ ایجاد کیا۔ تاکہ وہ ابتدائی خرابیاں پیدا نہ ہوں، جو آگے چل کر خانگی اور شہری زندگی کی بربادی کا باعث بنیں +

محرمات | بعض عورتیں مردوں کے ساتھ ایک ہی مکان میں پرورش پاتی ہیں،

جیسے ماں، بیٹی، بہن۔ اس لیے انسان کی طبعی فطرت یہ بن گئی ہے کہ مرد اپنی ماں، بہن اور بیٹی کی طرف رغبت نہیں رکھتا اور اُن کے ساتھ وہ تعلقات قائم نہیں کرسکتا، جو بیوی کے ساتھ ہوتے ہیں اُنہیں محرمات قرار دیا گیا ہے۔ اگر انسان کا خُلق سلامت ہو، تو محرمات سے اجتناب کرنا اُس کی جبلت ہوتی ہے۔ البتّہ یہ ممکن ہے، کہ کوئی خارجی حالت اسے ان محرمات سے نکاح کرنے پر مجبور کردے اور مصلحتِ وقتی اس کی تائید کردے۔ یہ استثنائی حالت ہے۔ لیکن عام فطرتِ انسانی یہی ہے، کہ مرد اُن عورتوں سے نکاح نہ کرے +

اگر ان محرمات کی طرف رغبت کو روکا نہ جاتا، تو چونکہ ان کے ساتھ ہر وقت گھر میں میل جول رہتا۔ اس لیے خانگی معاشرت میں فساد پھیل جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام دنیا کی قوموں میں ماں، بیٹی اور بہن کو محرمات قرار دیا گیا ہے اور اُن سے نکاح نہ کرنا معاشرتِ انسانی کا مُسلّمہ اُصول بن چکا ہے +

عورت کا مقام گھر میں فطرت نے مرد کی طبیعت عورت کی بہ نسبت زیادہ سخت، محنت کوش، مشقت کش اور زیادہ گرفت کرنے والی پیدا کی ہے اور اس کے مقابلے میں عورت طبعاً ضعیف ہے۔ یہی وجہ ہے، کہ معاشرۂ انسانی میں ہمیشہ مردِ مشقت کا کام کرتا ہے اور عورت گھر کی چار دیواری میں محفوظ رہ کر روزمرہ کے کاروبار کرتی رہی ہے۔ مثلاً گھر صاف رکھنا، کھانا پکانا، بچّوں کی نگہداشت کرنا وغیرہ +

عورت کی فطرت یہ بھی تقاضا کرتی ہے، کہ وہ جذباتِ جنسی کا اظہار نہ کرے اور بے باکی کے ساتھ مردانہ مجمعوں میں ظاہر نہ ہو۔ چونکہ یہ باتیں اُس کی حیاء کی پیداوار ہیں، اس لیے غیرت مند انسان انہیں پسند کرنے لگے۔ اس کے مطابق یہ ضروری ہوگیا، کہ لڑکیاں اپنے بَر خود تلاش نہ کریں، بلکہ اُن کے اَولیاء تلاش کریں۔ البتہ ان کے ساتھ بطریقِ لطیف مشورہ کرلیں +

بچے اور ماں باپ انسان کی نوع کا یہ تقاضا بھی ہے جو اللہ تعالےٰ نے اس نوع کے اندر رکھا ہے، کہ بیٹے اور بیٹیوں کو اپنے ماں باپ کا مطیع بنا دیا ہے۔ گو ماں باپ کو طبعًا بچّوں پر تسلّط حاصل ہوتا ہے، لیکن وہ شفقت اَور محبّت کا اظہار کرتے ہیں اور بچّوں پر اپنی حکومت محبت اور اُلفت کے ساتھ چلاتے ہیں۔ بیٹے اَور بیٹیاں جب بڑے ہوتے ہیں، تو طبعی طور پر اپنے ماں باپ کی شفقت اَور محبّت کا بدلہ اُن کی خدمت کی شکل میں دیتے ہیں +

"سیّد بالطبع" اور "عبد بالطبع" اگر غور سے دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا کہ تمام انسانوں میں دماغی اَور بدنی قوتیں برابر نہیں ہیں۔ کسی میں یہ قوتیں کم ہیں اور کسی میں زیادہ۔ یہ فرقِ مراتب طبعی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ "سیّد بالطبع" ہوتے ہیں۔ یعنی طبعی طور پر اُن میں ترقّی، بہادری، بلند ہمّتی اور طلبِ مشقّت کا مادّہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ طلب معاش میں فراوانی دکھاتے ہیں اور لوگوں کی خدمت کرنے میں بھی پیش پیش ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ خانہ داری

کا انتظام خوب کرسکتے ہیں +

بعض لوگ پست ہمّت ہوتے ہیں ۔ وہ طلب معاش کا کام برسرِ خود نہیں کرسکتے ۔ ایسے لوگ پہلی قسم کے لوگوں کے ماتحت رہ کر خوش رہتے ہیں وہ طبعًا دوسروں کے ماتحت رہ کر زندگی بسر کرنا پسند کرتے ہیں ۔ ایسا شخص جب تک کسی صاحبِ اقتدار کے ساتھ وابستہ نہ ہو جائے ، راحتِ طبع نہیں پاسکتا ۔ اور نہ اطمینان کی زندگی بسر کرسکتا ہے +

معاشرۂ انسانی میں بعض ایسے کام ہوتے ہیں کہ دوسروں سے کرانے پڑتے ہیں ۔ اُس صورت میں ایک انسان کو دوسرے کے ماتحت رہ کر کام کرنا ہوتا ہے ۔ جیسے فوج کا سردار ہزاروں انسانوں کو اپنے ماتحت رکھتا ہے ۔ ہر ایک سپاہی سپہ سالارِ اعظم نہیں بن سکتا ۔ اگر ماتحتی کی طبیعت رکھنے والے انسان سرداروں کی طبیعت رکھنے والوں کے ماتحت آجائیں ، تو ان کی زندگی اچھی طرح نبھ جاتی ہے ، ورنہ اکثر فساد پیدا ہو جاتا ہے +

غرض خداوند تعالیٰ کے پیدا کردہ نوعی تقاضوں سے شادی بیاہ ، تولید و پرورشِ اطفال اور ماتحتوں پر حکمرانی کے لیے سہ گانہ نظامات وجود میں آگئے ۔ اسے خانہ داری (House keeping) کہتے ہیں ۔ یہ میاں بیوی کے میل ملاپ سے پیدا ہوتی ہے +

خانگی جھگڑوں کا فیصلہ | اگر میاں بیوی میں جھگڑا ہو جائے اور نظامِ منزلی میں خرابی پیدا ہو جائے ، تو اُس کا فیصلہ حَکموں کے ذریعے سے کرایا جائے اور مرد اور عورت کی جانب سے ایسے حَکم مقرر کیے جائیں ، جو اُن کے حالات

سے بخوبی واقف ہوں۔ اسبابِ اختلافات کی تحقیقات کر سکیں، ان کے خیرخواہ ہوں اور پوری طرح عدل کر سکتے ہوں۔ اگر میاں بیوی کے درمیان موافقت ممکن نہ ہو، تو اُن کے درمیان تفریق (Separation) کرا دیں۔ اگر مرد تفریق پر راضی نہ ہو، تو قاضی (جج) اُس کا قائم مقام بن کر تفریق کرا دے. تاکہ ان کی باہمی نزاع ختم ہو جائے۔ یہ تفریق مال لے دے کر بھی ہو سکتی ہے اور اس کے بغیر بھی۔ بہرکیف میاں بیوی کو اعتدال پر قائم رہنا چاہیے۔ اور ایک دوسرے پر ظلم وجور نہیں کرنا چاہیے۔

تفریق کا اصول جب میاں بیوی کے درمیان تفریق ہو جائے، تو نکاح کی اہمیت کو قائم رکھنے، مثلاً اگر عورت حاملہ ہو، تو اُس بچّے کا نسب صحیح رکھنے کی غرض سے عورت دُوسرا نکاح کرنے سے پہلے کچھ عرصہ انتظار کرے، تاکہ معلوم ہو، کہ مصلحت منزلی کے اس حصّے کو بازیچۂ اطفال نہیں سمجھا گیا۔

بچّے کے حقوق نظامِ منزلی میں یہ بھی ضروری ہے کہ بچّہ پیدا ہو، تو اُس کا کوئی اچھّا سا نام رکھا جائے اور پھر ذبیحے کے ذریعے سے اُس کا عقیقہ کیا جائے۔ اس میں کئی نکتے ہیں:۔

اس طرح مرد لطیف طریقے سے بچّے کا باپ ہونے کا اعلان کرتا ہے اور لوگوں میں اس کی شہرت ہو جاتی ہے۔ نیز اس طرح ماں باپ کی طرف سے بچّے کی پیدائش پر خدا کا شکر ادا ہو جاتا ہے اور یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ مرد کو اپنے بچّے اور اُس کی ماں کی طرف رغبت ہے۔

پھر بچّے کی نشوونما کا مناسب بندوبست ہونا چاہیے اور مناسب عمر

میں اُس کی تعلیم و تربیت اور درستیٔ اخلاق کا بندوبست ہونا چاہیے۔ علوم وہ سکھائے جائیں، جو اُس کی دنیوی اور اُخروی زندگی میں کام آئیں۔ جب جوان ہو جائے، تو اُس کی شادی کر دی جائے اور اُسے کوئی ایسا کسب سکھایا جائے، جو معقول طور پر کما کھانے میں مدد دے اور اسے ہم چشموں میں عزت دلا سکے +

گھر میں مرد کا بلند مقام | کوئی نظام مرکز کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ نظامِ منزلی کا مرکز مرد ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے مرد کو گھر میں حاکمانہ فوقیت حاصل ہے، مگر وہ استبداد سے کام نہ لے، بلکہ حسبِ ضرورت اپنے کام کی تشریح کرتا رہے، تاکہ اہلِ خانہ اُس کے احکام کو سمجھ سوچ کر بجا لائیں +

میل جول کے فائدے | جو لوگ کسی شخص کی صحبت کے سب سے زیادہ لائق ہیں، وہ اس کے اپنے گھر والے ہیں۔ اس کے بعد اس کے ہمسائے اور دوست وغیرہ وغیرہ۔ ضروری ہے کہ یہ آپس میں ملیں جلیں اور ایک دوسرے کو تحفے دیں۔ خط و کتابت کریں اور معاش میں ایک دوسرے کے کام آئیں۔ آپس میں کلام کریں۔ مصیبتوں میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ کیونکہ انہی باتوں سے اُلفت کا قیام و قوام ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے، کہ ایک دوسرے کو سلام کریں۔ کسی کے گھر جائیں، تو اجازت لے کر داخل ہوں اور اجنبی عورتوں کو دیکھ کر نگاہیں نیچی کر لیں اور ایسی باتوں سے خاص طور پر پرہیز کریں، جن سے دلوں میں رفتہ رفتہ نفرت پیدا ہو جایا کرتی ہے +

۳۔ انتظامِ معاشی

حکمتِ اکتسابی یا نظامِ معاشی کی تعریف امام ولی اللہ نے یہ کی ہے کہ انسان اپنی معاش میں رفاہیت اور ذوقِ حسن یا ظرافت کا خیال رکھے اور کوشش کرے کہ انسان اپنی تمام ضرورتیں اوسط درجے کی رفاہیت سے پوری کرے۔ اگر یہ کوشش نہ کی جائے، تو انسان سخت تکلیف اور رنج وغم میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اتنی حاجتیں جمع ہو جاتی ہیں، کہ ایک شخص انہیں بطریقِ احسن پوری نہیں کرسکتا۔

پیشوں کی تخصیص کی ضرورت | موجودہ انسانی سوسائٹی پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ انسان اپنی معاش مختلف پیشوں کے ذریعے سے پوری کرتا ہے۔ اس کا سبب امام ولی اللہ یہ قرار دیتے ہیں، کہ ارتفاقات کی دوسری منزل میں انسان کی ضرورتیں اتنی بڑھ گئیں، کہ اب سب کا فراہم کرنا ایک شخص تو کیا، ایک خاندان کے بھی بس میں نہ رہا۔ لامحالہ دوسرے خاندانوں کی مدد کی ضرورت پڑی۔ مثلاً شروع شروع میں انسان اپنے اور اپنے خاندان کی ضرورت کے مطابق بیج بوتا تھا اور جب فصل پک جاتی، تو کاٹ کر کام میں لاتا تھا۔ یہ ارتفاقِ طبعی (Natural Economy) کی منزل تھی، جس میں اشیاء مبادلے (Barter) کے لیے پیدا نہیں کی جاتیں۔ رفتہ رفتہ پیداوار بڑھانے کے طریقے ایجاد ہو گئے اور مبادلے (Barter) کے لیے پیداوار ہونے لگی۔ اسے

تجارتی پیداوار (Commodity Economy) کہتے ہیں۔ اب کاشتکاری کے لیے انسانی مشقّت (Human Labour) کے بجائے حیوانی مشقت (Animal Labour) کی ضرورت پڑی۔ جس کے لیے حیوانوں کو قابو میں لاکر پرورش کرنے کی حاجت ہوئی۔ اس کے علاوہ اچھی کاشتکاری کے لیے نجّاری اور حدّادی کی ضرورت پڑی اور ظاہر ہے، کہ کسی کام میں حُسن پیدا کرنے کے لیے اُسے بار بار کرنا پڑتا ہے اور اُس کے متعلق بہت سی معلومات جمع کرنی ہوتی ہیں۔ اور اس طرح اس کام میں تخصُّص (Specialisation) پیدا کیا جاتا ہے۔ مگر ایک انسان کیا، ایک خاندان بھی یہ سب کام بطریق احسن سرانجام نہیں دے سکتا۔ ایسے ہی اچھا کھانا تیار کرنے کے لیے انسان کو فنِ طبّاخی (Cookery) اور اچھا لباس تیار کرنے کے لیے فنِ خیاطی کی حاجت ہے۔ حاصل کلام یہ ہے۔ کہ ایک خاندان والے بڑی کوشش کریں گے، تو زیادہ سے زیادہ ارتفاقِ اوّل کی چیزیں پیدا کرسکیں گے۔ مگر ایسی چیزیں پیدا کرنے کے لیے جن میں ہر حاجت کو پورا کرنے کے لیے افادیت کے علاوہ حُسن و جمال کی بھی رعایت رکھی جاتی ہے، ایک خاندان کی کوششیں بکار آمد نہیں ہوسکتیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ سوسائٹی میں تقسیم عمل (Division of Labour) سے کام لیا جائے اور ایک ایک گروہ اِن کاموں میں سے ایک ایک کام (Occupation) اختیار کرکے اس میں پختگی (Experience) اور مہارت (Skill) پیدا کرے اور اس ایک پیشے ہی سے اپنی جملہ ضروریات پوری کرے۔

بعد میں جب ارتفاقِ سوم، یعنی تہذیب کی تیسری منزل میں حکومت قائم ہوئی، تو نظامِ حکومت چلانے کے لیے معاونین (Assistants) کی ضرورت پڑی۔ رفتہ رفتہ دفتری کام (Clerical Work) بھی ایک مستقل پیشہ بن گیا +

مبادلے کی ضرورت | جب انسان کی حاجتیں بڑھیں اور اس نے ارتفاقِ دُوم میں قدم رکھا، تو یہ مشکل محسوس کی جانے لگی کہ کوئی شخص مبادلہ جنس (Barter) سے اپنی ضرورتیں پوری نہیں کر سکتا۔ مثلاً ایک موچی نے جوتے کا ایک جوڑا بنایا۔ اُسے توقع تھی کہ نُوربافت سے اس کے عوض کپڑا مل جائے گا۔ لیکن نُورباف کو فی الحال جوتے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے موچی اپنی ضرورت اُس سے پُوری نہ کر سکا۔ سوسائٹی میں اس قسم کے واقعات رونما ہونے لگے، تو عقلمند لوگوں نے کسی ایسی چیز کی تلاش کی، جو خود تو کسی کام کی نہ ہو، مگر معاوضہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہو اور جلدی خراب بھی نہ ہوتی ہو۔ رفتہ رفتہ سونے اور چاندی کو اس غرض کے لیے استعمال کیا جانے لگا اور سکّے (Coin Money) کا رواج شروع ہو گیا[1] +

اس طرح ارتفاقِ دوم یعنی تہذیب کی دوسری منزل میں ہیئتِ اجتماعیہ (Society) منتظم ہو گئی +

پیشہ اختیار کرنے کا اصول | سوسائٹی میں رہتے ہوئے انسان کو کوئی نہ کوئی پیشہ تو اختیار کرنا پڑتا ہی ہے؛ مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کیسا پیشہ اختیار کرے؟ اس کا جواب حضرت امام ولی اللہ یہ دیتے ہیں کہ پیشہ وہ اختیار کرے، جو

---

[1] بدور بازغہ ص ۶۷

انسان کی حاجتیں پوری کرے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:-

"ایک شخص کو بھوک زیادہ لگتی ہے، مگر وہ کسب ایسا اختیار کرتا ہے، جو اس کی حاجتیں پوری نہیں کرتا۔ وہ ضرور بھیک مانگنے اور ذلیل کام کرنے کی طرف مائل ہو جائے گا۔ بعض لوگ یوں تو قوی الجثّہ ہوتے ہیں، لیکن زیادہ کماتے نہیں، وہ زنا اور بدکاری کی طرف رجوع کرتے ہیں"+

پیشوں کی تقسیم اور حکومت معاشرۂ انسانی میں جب معاملات کی کثرت ہو جاتی ہے اور ضرورتیں بڑھ جاتی ہیں، تو جیسے اوپر دکھایا جا چکا ہے، ایک آدمی یا ایک خاندان اپنی ساری کی ساری ضرورتیں اچھی طرح پوری نہیں کر سکتا لامحالہ ضروری ہوتا ہے کہ بعض لوگ بعض پیشوں کو مخصوص طور پر اختیار کر کے ان میں مہارت پیدا کر لیں تاکہ اچھے سے اچھا کام ہو سکے۔ لیکن اگر ان پیشوں کو کسی کنٹرول میں نہ رکھا جائے۔ تو اس سے معاشرۂ انسانی کو بہت سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے:-

(۱) اگر اکثریت ایک پیشہ یا کسب اختیار کرلے، تو دوسرے پیشوں کی ضرورتیں پوری نہیں ہو سکیں گی۔ مثلاً اکثر لوگ صنعت و حرفت میں لگ جائیں یا سرکاری دفتروں میں کلرکی کے پیچھے پڑ جائیں، تو مویشیوں کی پرورش اور کاشت کاری کرنے والوں کی تعداد گھٹ جائے گی۔ پیشوں کے اس عدمِ توازن سے سوسائٹی کی اجتماعی زندگی برباد ہو جائے گی۔

(۲) بعض لوگ ایسے پیشے اختیار کر لیتے ہیں یا ایسی اشیاء کی صنعت کاری

شروع کر لیتے ہیں، جس سے سوسائٹی پر برا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً فحش، برہنہ تصاویر یا مجسموں کی ساخت اور فروخت یا ایسی مخرب اخلاق کتابوں کی اشاعت یا دل آزار ... پیدا کرنا۔

ان حالات کے انسداد کے لیے ضروری ہے کہ حکومت پیشوں اور پیشہ وروں اور ان کی صنعت پر اس طرح سائنٹفک طریق سے ضبط قائم کرے کہ سوسائٹی کی حالت خراب ہونے نہ پائے[1]۔

ممنوع چیزیں | عام سوسائٹی کے لیے مفید قانون ہیں جن اصولی چیزوں کی خرید و فروخت کی ممانعت ہونی چاہیے، وہ بقول حضرت امام حسب ذیل ہیں:۔

(۱) وہ چیزیں جو سوسائٹی کے عام اخلاق کو برباد کرنے والی ہوں۔ ان میں بعض چیزیں تو ایسی ہیں، جو براہ راست اخلاق عامہ کو برباد کرتی ہیں۔ ان کی خرید و فروخت سے بداخلاقی اور سیہ کاری کی براہِ راست ترویج و اشاعت ہوتی ہے، جیسے شراب۔ ایسے ہی بداخلاقی اور بدکاری میں مدد دینے والی چیزیں بھی ممنوع ہیں مثلاً "مغنیہ کا پیشہ"۔

(۲) گندی اور سڑی ہوئی چیزیں، جن سے نہ صرف انسان کی حس پاکیزہ مزاجی کو تکلیف پہنچتی ہے، بلکہ صحت کے لیے بھی مضر ہیں۔

(۳) ایسے معاملات جو نزاع (Litigation) کا موجب ہوں۔ مثلاً قیمت اور مال کا متعین نہ ہونا یا پیمانے کا معین نہ ہونا یا بیع در بیع، مثلاً خریدار فروخت کنندہ سے کسی چیز کے خریدتے وقت یہ قید لگا دے کہ میں یہ چیز تم

[1] حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم، ص۱۰۵

سے اس رقم میں اس شرط پر خریدتا ہوں، کہ تم مجھ سے اتنی رقم میں فلاں چیز خریدو۔ یا بن دکھائے مال بیچنا یا خرید و فروخت میں کوئی ایسی شرط آجائے، جو آگے چل کر جھگڑے کا سبب بنے۔ یا کچے پھل بیچنا یا غیر مقبوضہ چیز کی فروخت۔ غرض خرید و فروخت میں معاملہ بالکل صاف واضح اور بیّن ہونا چاہیے اور کسی قسم کی پوشیدگی، ابہام اور لاعلمی نہیں ہونی چاہیے اور ہر چیز متعین ہونی چاہیے۔ لیکن عدم تعین کو مبالغے کی حد تک نہیں پہنچایا جاسکتا۔ عدم تعین صرف وہ مضر ہے جو موجب نزاع بن سکے +

(۴) خرید و فروخت میں مسابقت بھی نقصان رساں ہوتی ہے۔ اس لیے ایک شخص کی بیع میں دخل دینا یا بولی پر بولی دینا یا دوسروں کو خریداری سے روکنے کے لیے بولی بڑھانا ناجائز ہے اور نہ یہ تمدن کے لیے مفید ہے، کہ شہری آدمی دیہاتی کا دلّال بنے۔ اس میں ایک نقصان تو یہ ہے، کہ دیہاتی لوگ زیادہ نفع کے لالچ میں دلّالوں کے پھندوں میں پھنس کر خراب ہوتے ہیں۔ دوسرے اس سے اہل شہر کو یہ نقصان پہنچتا ہے کہ دلّال مال روک رکھتے ہیں اور گراں کر کے بیچتے ہیں۔ پس یہ بہتر ہے کہ دیہاتی لوگ بار بار تھوڑا تھوڑا مال لے کر آئیں اور مناسب قیمت پر بیچیں +

(۵) ایسے طریق سے نفع اندوزی (Profiteering) جس سے سوسائٹی کے اکثر افراد کو تکلیف پہنچے ممنوع ہے مثلاً اِحتکار (Hoarding) یعنی

زیادہ نفع کمانے کی خاطر غلّے وغیرہ کو روکے رکھنا+

(۶) دھوکہ دے کر نفع حاصل کرنا جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مثلاً مال کا عیب چھپانا یا مال کو حقیقت سے زیادہ اچھا ظاہر کرنا اور مصنوعی طور پر چمک دمک دکھا کر قیمت بٹورنا یا اچھی چیز میں اسی جنس کی ادنیٰ درجے کی چیز ملا کر بیچنا (Adulteration)+

(۷) ایسی چیزوں کی بیع بھی ممنوع ہے، جو خدا تعالےٰ نے سب انسانوں کے لئے پیدا کی ہیں۔ مثلاً قدرتی طور پر بہتا پانی۔ ایسے پانی کو روک کر بیچنا ناجائز ہے+

۴- لین دین

حکمتِ تعاملیہ یا لین دین کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے حضرت امام ولی اللہ فرماتے ہیں کہ جب ایک شخص نے کسی خاص پیشے میں امتیاز و تخصّص (Specialisation) پیدا کر لیا، تو معلوم ہوا کہ ایک ہی کام اُس کی ضرورتیں پوری نہیں کرتا۔ بعض اوقات اشیاء مفت دینے کی ضرورت پڑی۔ تاکہ لوگوں کی اُلفت حاصل کی جائے کہ یہ بھی بجائے خود ایک ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے سے ضروریاتِ انسانی اور امداد باہمی حاصل ہوتی ہے۔ ایسے ہی بعض اوقات اظہارِ وفا یا رحم کی وجہ سے روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت پڑی تاکہ ارتفاق پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ پس عنایتِ الٰہی نے انسان کی مبادلے کی طرف رہنمائی کی+

مبادلے کی شکلیں مبادلے کی کئی شکلیں یہ ہیں:-

(۱) بَیع :۔ اس میں مال (Goods) کا مبادلہ مال کے ساتھ کیا جاتا ہے +

(۲) ہِبہ :- اس سے مراد یہ ہے کہ دنیاوی یا اُخروی نفع کی اُمید پر کوئی چیز بلا معاوضہ کسی کو دے دینا +

(۳) اِعارہ : اس میں منافع بلا معاوضہ دیا جاتا ہے +

(۴) دَین : اس میں اعارہ اور بیع دونوں کی صفتیں پائی جاتی ہیں - البتہ اس میں کبھی بیع کے معنی غالب ہوتے ہیں، جیسے بیع سلم میں جس میں نقد روپیہ لے کر جنس بعد میں دیر سے دی جاتی ہے اور کبھی اعارہ کے معنی غالب ہوتے ہیں، جیسے روپے پیسے کا قرض ہے - جس میں نقد دے کر اس کے منافع کا عوض نہیں لیا جاتا +

مبادلے کے اصول اس ارتفاق کو معاشرۂ انسانی کے واسطے مفید بنانے کے لیے ضروری ہے، کہ جس چیز کی خریدو فروخت کی جائے، اُس کی قیمت، اُجرت اور منفعت کے متعلق ہر بات صاف صاف طے کر لی جائے اور ہر فرد دھوکے سے بچے، یعنی ایسی چیز نہ لے بیٹھے، جو اُس کی حاجت پوری نہ کرتی ہو +

مبادلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ فریقین سودے کے متعلق ایجاب و قبول کریں یا نقدا نقد سودا ہو، تاکہ مبادلے میں جانبین کی رضامندی کا اظہار ہو جائے یہ بھی لازم ہے کہ چیز پر اس مجلس ہی میں غور کر لیا جائے اور اگر لوٹانی ہو، تو الگ ہونے سے پہلے لوٹا دی جائے +

لین دین میں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص لینے یا دینے کا وعدہ کرکے مکر جاتا ہے یا انکار کر دیتا ہے۔ قدرت نے انسان کے دل میں یہ بات ڈالی ہے، کہ اگر لین دین نقداً نقد نہ ہو، تو اُسے ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔ جس پر باقاعدہ شہادت ہو۔ اور رہن رکھا جائے، تو بھی وثیقہ تحریر کر لیا جائے۔ اس سے سوسائٹی میں آپس کے جھگڑے کم ہو جاتے ہیں ؂

چند مفید اصول | معاشرۂ انسانی میں سے جھگڑے کے مواقع کم کرنے کے لیے مندرجۂ ذیل قوانین ضروری ہیں:۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر پیدا کرکے اُس کی روزی کا سامان بھی یہیں فراہم کر دیا ہے اور سب انسانوں کو حق دیا ہے کہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ لیکن انسان کی خود غرضانہ مُسابقت (Competition) اور باہمی تنازع کو روکنے کے لیے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ جو شخص کسی قطعۂ زمین سے سب سے پہلے نفع حاصل کرنا شروع کر دے، وہ اس کی ملکیت ہوئی۔ اب کسی کو حق نہیں ہے کہ اس سے انتفاع کر سکے۔ تاوقتیکہ پہلے قبضہ کرنے والا رضامندی کے ساتھ خود ہی اسے نہ دے دے یا برضائے خود مبادلے کے لیے آمادہ نہ ہو جائے۔ ان دونوں صورتوں میں بھی کسی قسم کا فریب اور دھوکہ نہیں ہونا چاہیے۔ اسی کا نام "حقِ ملکیت" یعنی حقِ انتفاع ہے۔ ورنہ زمین کا اصل مالک تو خدا تعالیٰ ہی ہے۔ لہٰذا جو شخص آبادی کے باہر کسی افتادہ اور

غیر مزروعہ زمین کو سب سے پہلے آباد کرے اور اس کے اس فعل سے کسی کو نقصان بھی نہ پہنچتا ہو، تو وہ اس زمین کا "مالک" بن جاتا ہے۔ اگر کسی زمین کا "مالک" مر جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو، تو وہ پھر سب کے لیے مباح ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ پھر سے حکومت کے تابع آجاتی ہے اور اب وہ جسے چاہے دے سکتی ہے۔

(۲) قانونِ معیشت کا دوسرا فطری اصول یہ ہے، کہ نظامِ تمدّن ایسا ہونا چاہیے کہ سوسائٹی کے سب افراد اُس میں حصّہ لیں اور ایک دُوسرے کی مدد کریں۔

(۳) تیسرا طبعی قانونِ تمدّن یہ ہے، کہ جو چیزیں قدرت نے عام فائدے کے لیے پیدا کی ہیں اور جن کو کارآمد بنانے میں کسی خاص شخص یا جماعت کی محنت و قابلیت کا دخل نہیں، اُنہیں حتّی الامکان ایسی شکل میں رہنا چاہیے، کہ ہر ایک شخص ان سے استفادہ کر سکے۔ جس چیز کو روکے بغیر اس سے استفادہ ممکن نہ ہو اس کے لیے یہ قاعدہ ہونا چاہیے، کہ ہر ایک شخص اُسے اتنا ہی روکے، جتنا روکنا ضروری ہو۔ مثلاً کھیت کو پانی دینا ہو، تو سب سے پہلے اُس کسان کی باری ہے، جس کا کھیت پانی کے بہاؤ میں سب سے پہلے پڑتا ہے۔ جب وہ اپنے کھیت کو سیراب کر لے، تو اُس سے آگے یا سامنے کے متصل کھیت کی باری ہوگی۔ اسی ترتیب سے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ تمام کھیت سیراب ہو جائیں۔

روکنے میں بھی ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ پوری احتیاط کرے کہ کسی کو تنگی یا تکلیف نہ پہنچے۔ ایسے ہی چارہ اور جنگل کی لکڑیاں قدرت کا عام انعام ہیں۔ کسی کا حق نہیں کہ اپنے لیے مخصوص کرے۔ حضرت صالح علیہ السّلام کے عہد میں جو انقلاب آیا، وہ اس لیے تھا کہ سوسائٹی کے چھوٹے سے طبقے نے جو اکابر پر مشتمل تھا، پانی جیسی عام چیز کو اپنے مویشی کے لیے مخصوص کرلیا تھا +

(۴) تمدّنِ انسانی کا چوتھا قانون طبعی یہ ہے، کہ سب لوگ مل جل کر سوسائٹی کی پیداوار بڑھائیں اور نئی ایجادات و اختراعات کے ذریعے سے ارتفاقات کی اصلاح کی کوشش کریں +

جوا اور سٹّہ بازی کیوں ممنوع ہے؟ ثقافتی اور تمدّنی زندگی کی رُوح بقول حضرتِ امام الائمہ تعاوُن ہے۔ لہذا ترقیِ اموال کے وہ تمام ذرائع جو تعاوُن کی روح سے خالی ہوں اصولِ فطرتِ انسانی کے لحاظ سے بالکل ناجائز اَور اصول تمدّن کے منافی ہیں، جیسے قمار بازی (Gambling) اَور سٹّہ (Speculation) جن میں اگرچہ مبادلہ ہوتا ہے، لیکن وہ کسی منفعت بخش چیز کے پورے معاوضے کے بدلے میں نہیں ہوتا، بلکہ قمار باز اپنی جہالت اور لالچ کے باعث اس جھوٹی اُمید پر، کہ ایک ہی داؤں میں مجھے بہت سی دولت ہاتھ آجائے گی، ایک کثیر رقم کی شرط بد لیتا ہے۔ ظاہر ہے، کہ اس ذریعۂ اکتساب میں تعاوُن کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اب اگر وہ شرط ہار گیا، تو اُسے قہرِ درویش بجان درویش

خاموش ہو جانا پڑے گا اور اگر جیت گیا، تو اُس کی یہ کمائی کسی خدمت کے بغیر ہوگی۔ معاشرت میں ایسے پیشے اصول انسانیت کے خلاف ہیں۔

سُود کی ممانعت ایسے ہی رزق کمانے کے وہ ذرائع جن میں بظاہر تعاوُن کی شکل موجود ہے، لیکن اس کی تہ میں تعاوُن کی موت پوشیدہ ہے انسانیت اور معاشرے کے لیے سمّ قاتل کا حکم رکھتے ہیں۔ جیسے سودی کاروبار۔

سود یا ربا، سے مراد قرض لی ہُوئی چیز سے زیادہ یا بہتر واپس دینا ہے، حضرت امام صاحب اس کی دو قسمیں کرتے ہیں:۔

(۱) رباءِ حقیقی یعنی اصلی سُود اور (۲) رباء بالفضل

حقیقی سُود نقد قرضوں پر ہوتا ہے۔ جنس کا قرض بھی، جس پر سُود لگایا جائے، اسی ذیل میں آتا ہے۔

رباء بالفضل سے مراد یہ ہے کہ کوئی جنس اس شرط پر اُدھار دی جائے، کہ ادا کرتے وقت اس سے بہتر جنس لی جائے گی۔ مثلاً سرخ گندم اُدھار دے کر سفید گندم واپس لینا اسے اصلی سُود سے مشابہت کی وجہ سے سود قرار دیا گیا ہے۔ البتہ جب جنس ایک نہ ہو اور سودا دست بدست ہو، تو سود قرار نہیں پاتا۔

اُوپر دکھایا جا چکا ہے کہ معاملات کی روح تعاوُن ہے۔ لیکن سودی کاروبار تعاوُن کی روح سے قطعاً عاری ہوتا ہے۔ اس میں قرض خواہ بظاہر مقروض کو مالی مدد دیتا ہے اور مقروض قرض خواہ کو کچھ زائد دینے کا وعدہ

اپنی مرضی سے کرتا ہے، لیکن اس لین دین کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے، تو نہ قرض خواہ کی نیت ہوتی ہے، کہ وہ مقروض کو مالی مدد دے اَور نہ مقروض اپنی مرضی اَور خوشی سے زائد رقم ادا کرتا ہے۔ چنانچہ اگر مقروض سُود دینے کا وعدہ نہ کرے، تو قرض خواہ اُسے ہرگز مالی مدد نہیں دیتا۔ ادھر مقروض صرف افلاس اور ناداری کے مارے سُود ادا کرتا ہے۔ اگر کسی وقت خود قرض خواہ مقروض ہو جائے، تو اِفلاس کی حالت میں خوشی سے اُس طرح سُود دینا قبول نہ کرے گا، جس طرح اناج مول لیتے وقت خوشی سے دام ادا کرتا ہے۔ لہٰذا مقروض کی رضامندی کو حقیقی رضامندی نہیں کہا جاسکتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرض خواہ کی "مالی امداد" تعاون کی روح سے خالی ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کاروبار انسانیت اَور تمدّن کے اصول کے قطعاً منافی ہے +

قرض ہمیشہ وہ لوگ لیتے ہیں، جو مُفلس ہوں اَور وہ بھی اس وقت جب وہ اپنی ضرورت کسی اَور طرح پوری نہ کرسکنے کی وجہ سے مُضطر ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر مُفلس وقتِ مقررہ پر ادا بھی نہیں کرسکتے۔ اس لیے اُنہیں سُود در سُود ادا کرنا پڑتا ہے اور وہ اس سے مشکل ہی سے نجات پاتے ہیں +

سُودی کاروبار بہت سے جھگڑوں کا مُوجب ہوتا ہے، جو شخصی بھی ہوسکتے ہیں اور بین الاقوامی بھی۔ یہ بعض اوقات خطرناک جنگوں کا موجب بنتے ہیں +

سُودی کاروبار کا اثر اخلاقِ انسانی پر بھی نہایت ناگوار پڑتا ہے۔ جو لوگ سُود خوری کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں، وہ مقروضوں سے روپیہ وصول کرنے میں بہت سختی کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ایسے اشخاص میں مروّت کی روح بالکل مر جاتی ہے اور وہ خلقِ سماحت[1] سے بالکل عاری ہو جاتے ہیں۔

سُودی کاروبار سے آگے چل کر سرمایہ پرستی (Capitalism) پیدا ہو جاتی ہے، جو مدنیت اور انسانیت کی روح کو فنا کر دیتی ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر قوموں کی شہنشاہیت (Imperialism) پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔

سُودی کاروبار سے رفاہیتِ بالغہ یعنی پُر تکلف زندگی پیدا ہوتی ہے۔ مطلق رفاہیت تو یہ ہے، کہ انسان زندگی بسر کرنے کے اچھے طریقے استعمال کرے مثلاً کھانے میں صاف پاک چیزیں استعمال کرے اور سڑی ہوئی خراب چیزوں سے پرہیز کرے یا صاف ستھری جگہ بیٹھ کر شائستگی کے ساتھ کھائے۔ رفاہیتِ بالغہ یہ ہے، کہ ایک ہی جنس کی چیزوں میں سے بہترین چیز کا انتخاب کرنا۔ مثلاً کپڑے کی ضرورت ہو، تو معمولی صاف ستھرے کپڑے کی بجائے کمخواب اور ابریشم استعمال کرنا۔ یہ تعیش

[1] حضرتِ امام صاحب انسانیت کے لیے چار بنیادی خلق ضروری قرار دیتے ہیں، ان میں ایک خلقِ سَمَاحَۃ بھی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان دنیاوی چیزیں استعمال کرے، تو ان میں انہماک پیدا نہ کرے۔ کیونکہ یہ انہماک اس کی مرنے کے بعد کی زندگی کے لیے مضر ثابت ہوتا ہے۔ (مؤلف)

کی زندگی ہے۔ جو تعمق فی الدنیا کا نتیجہ ہے۔ معاشرے میں چند لوگ ہی ایسی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اُنہیں اس قسم کی پُر تکلّف زندگی بسر کرنے کے لیے زیادہ دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ یہ دولت سُود وغیرہ کے ذریعے حاصل کرتے ہیں، کہ دولت اس محدود طبقے میں بند ہو کر رہ جاتی ہے اور سوسائٹی کا بڑا طبقہ جو غرباء پر مشتمل ہوتا ہے، امرا کے طبقے کا دست نگر بن جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ ایک طرف تو یہ غریب طبقہ انسانی فضائل ہی سے محروم ہو جاتا ہے اَور دوسری طرف معاشرہ انسانی میں بنیادی پیشے، جن پر اجتماعِ انسانی کا مدار ہے، مثلاً زراعت، صنعت و حرفت وغیرہ، کاریگروں کی کمی کی وجہ سے برباد ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ ان کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں، جن کا تعلق امراء کی عیّاشانہ زندگی کے ساتھ ہوتا ہے +

مذکورۂ بالا خرابیاں اس بات کی مقتضی ہیں کہ انسانی معاشرے کو سُود جیسی لعنت سے بچانے کے لیے اُن لوگوں کو، جو سُودی کاروبار سے باز نہ آئیں، ایسی سخت سزا دی جائے، جیسی اُن لوگوں کو دی جا سکتی ہے، جو خود حکومت کے باغی ہوں +

قمار بازی اَور سودی کاروبار دونوں انسانی معاشرے کے لیے ویسے ہی غیر طبعی ہیں، جیسے انسان کی طبعی غذاؤں کے مقابلے میں شراب نوشی۔ اس سلسلے میں مقدار کی کمی بیشی کا سوال بالکل غیر مناسب ہے۔ جس طرح مُسکرات میں سے کسی چیز کا استعمال تھوڑی سی مقدار سے

بڑھتے بڑھتے بہت بڑی مقدار تک پہنچ جاتا ہے، وہی صورت قمار بازی اور سود میں پیش آتی ہے۔ یعنی انسان تھوڑا سود لینا شروع کرے، تو رفتہ رفتہ زیادہ بڑی مقدار تک پہنچ جاتا ہے۔ ایسے ہی قمار بازی معمولی حالت میں شروع کی جائے، تو آہستہ آہستہ اس کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے۔ اس لیے سود اور قمار بازی دونوں کو سوسائٹی سے قطعاً نکال دینا ضروری ہے۔

رشوت ایسے ہی رشوت معاشرۂ انسانی کے لیے مضر ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے سے دوسرے کے مال یا حق پر ناجائز قبضہ کیا جاتا ہے۔ معاشرۂ انسانی میں جھگڑوں کے سدِ باب کرنے اور ہر ایک کو اس کا حق صحیح طور پر دینے دلانے کے لیے رشوت کا دور کرنا اشد ضروری ہے۔ اس کے بغیر سوسائٹی میں عدل قائم نہیں ہو سکتا۔ نہ عدل کرنے والوں پر اعتماد قائم ہو سکتا ہے۔

وقف کی ضرورت سوسائٹی میں لین دین ہوتا ہے، تو وہ ہمیشہ صرف قیمت ادا کرنے پر نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات محض احسان کی خاطر بھی کوئی چیز دی جاتی ہے۔ مثلاً صدقہ، ہدیہ، ہبہ اور وصیت وغیرہ۔ یہ سب طریق انسانی سوسائٹی اپنے دورِ ارتقاء میں پیدا کر چکی ہے۔ لیکن ان کی منفعت زیادہ تر شخصی ہے اور بہت محدود حلقے تک رہ سکتی ہے۔ بقول امام ولی اللہ حجازی انقلاب کے داعی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کی تحریک ایک عالمگیر اجتماعی تحریک تھی،

احسان کا ایک اجتماعی طریق تجویز فرمایا، جسے وقف کہتے ہیں۔ یہ اُن مصالح پر مبنی ہے، جو مذکورہ بالا کسی طریقِ صدقہ سے بھی پورے نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ایک آدمی کئی لاکھ روپیہ فقیروں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ وہ دو دو چار چار دس دس روپے لے کر چلے جاتے ہیں اور چند دن کے بعد پھر ویسے ہی قلاش ہو جاتے ہیں۔ نیز ان کے بعد آنے والے فقراء داد و دہش سے محروم رہ جاتے ہیں۔ وقف میں یہ خوبی ہے۔ کہ اس میں اصل ذریعہ پیداوار محفوظ رہتا ہے اور اس کے منافع سے مساکین کو فائدہ پہنچتا رہتا ہے اور شے موقوفہ پر مالکِ وقف کا قبضہ بھی قائم رہتا ہے۔ اجتماعی نفع رسانی کی یہ بہترین شکل ہے۔

۵۔ امدادِ باہمی

معاشرۂ انسانی میں رہنے والے ہر ایک انسان کا حق ہے، کہ وہ بھوکا نہ سوئے۔ اس کے کھانے پینے، کپڑے لتے، مکان، صحت اور اور تعلیم کی عام ضرورتیں پوری ہوں، لیکن اس حق کے پورا ہونے کے بعد دیکھا جاتا ہے، کہ تمام افراد مشین میں بنے ہوئے پرزوں کی طرح یکساں نہیں ہوتے، بلکہ قابلیت، اہلیت اور اخلاق و عادات میں فرق ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض تیز فہم ہوتے ہیں۔ بعض نسبتہً کندذہن۔ بعض کا رجحانِ طبع ایک پیشے کی طرف ہوتا ہے۔ اور بعض کا دوسرے

کی طرف۔ یہ فرقِ مراتب و اختلافِ رجحانِ انسان کے لیے طبعی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ زیادہ کما سکتے ہیں، بعض کم۔ زیادہ کمانے والوں کا طبعی فرض یہ ہے کہ اپنے کم قسمت ہم جنس افراد کی کم سے کم طبعی ضرورتوں کا خیال رکھیں، ورنہ نظامِ معاشرہ بگڑ جائے گا+

تعاون کی ضرورت: اس فرقِ مراتب کی وجہ سے معاش میں خلل پڑ سکتا ہے۔ اس لیے تعاون کی ضرورت ہے۔ مثلاً ایک شخص کو اپنے حق کے استقرار کے لیے دوسرے آدمی کی ضرورت ہے، جو اُس کے حق کی خاطر جھگڑے۔ اس لیے اُسے وکیل مقرر کرنا پڑتا ہے یا کسی آدمی کو کفالت پر کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے تمام حالات میں تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بھی انسانی معاشرے کا ایک ضروری جزء ہے اور ارتفاقِ دُوم میں اس کی ضرورت پڑتی ہے+

تعاون کی صورتیں: یہ ظاہر کہ سوسائٹی کا نظام محض انفرادی کوششوں سے نہیں چل سکتا۔ ترقی دینے کے لیے آپس میں اشتراکِ عمل اور تعاون سے کام لینا انسان کا فطری تقاضا ہے۔ ارتفاقاتِ انسانی کی ترقی تو موقوف ہی تعاون و اشتراک پر ہے۔ کاروبار (Business) میں بھی تعاون و اشتراک نہایت مفید نتائج پیدا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں حضرتِ امام بعض مندرجۂ ذیل صورتیں بیان کرتے ہیں جو معاشرے میں پیدا ہو چکی ہیں+

(۱) مُضاربت: اس میں ایک شخص کا مال ہوتا ہے اور دُوسرا اُسی سے تجارت کرتا ہے اور نفع آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں+

(۲) مُفاوَضت: اس میں چند آدمی برابر کا مال شریکِ تجارت کر کے مشترکہ طور پر خرید و فروخت کرتے ہیں اور نفع آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ یہ ایک دُوسرے کے وکیل اور کفیل ہوتے ہیں +

(۳) عنان: یہ ہے کہ معیّن مال میں شریک ہو کر کاروبار کیا جائے۔ مگر کوئی شخص دوسرے کا کفیل نہ ہو، جس سے وہ آپس میں ایک دوسرے سے مطالبہ کر سکیں +

(۴) شرکتِ صنائع (Guildism) اس میں ایک پیشے کے لوگ مل کر محنت کرتے ہیں اور اُجرت آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں +

امام صاحبؒ کے نزدیک ان سب میں یہ شرط ہے، کہ آپس میں جھگڑے کی کوئی شکل پیدا نہ ہو سکے +

مُزارَعت حضرت امام صاحبؒ کاروباری مُعاوَنت کی ایک اور شکل مُزارَعت بھی لکھتے ہیں۔ جس میں ایک شخص کی زمین ہوتی ہے اور دُوسرے کی محنت اور آلاتِ کشاورزی +

امام ابوحنیفہؒ مخالف ہیں اسلامی انقلاب سے پہلے عرب میں عام طور پر مُزارعت کا رواج پایا جاتا تھا۔ لیکن عدلِ اسلامی قائم ہونے کے ابتدائی دَور میں مُزارعت کو ناپسند کیا گیا اور جو لوگ مزارعت کرتے تھے، اُنہوں نے اس بنا پر ترک کر دیا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس سے منع فرما دیا تھا۔ بعد کے زمانے میں جب ارتجاع (Reaction) شروع ہو گیا، بعض بڑے بڑے لوگ مزارعت پر عمل پیرا ہونے لگ گئے۔ لیکن فنِ قانون سازی —

فقہ ـــ کے بہترین ماہر حضرت امام ابوحنیفہؒ نے، جن کی قانونی تفریعات (Bye-Laws) صدیوں اسلامی حکومتوں میں زیرِ عمل رہیں، مزارعت کو جھگڑوں کی بنیاد پا کر خلافِ قانون قرار دیا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی یہ دُور اندیشی قابلِ داد ہے، کہ مزارعت کے نقصانات، جس نے آگے چل کر جاگیرداری کی شکل اختیار کر لی، اتنی جلد بھانپ لیے۔ تاریخ شاہد ہے، کہ چھٹی صدی ہجری میں مزارعت اور جاگیرداری کی وجہ سے کاشت کاروں کا حال اتنا بُرا ہو گیا تھا، کہ ایک فاضل مصنّف ابنِ زینؒ کو لکھنا پڑا کہ:-

ان المشاهدة الآن ان اکثر الظلم انما هو علیٰ اهلِ الحرثِ

(یعنی آج ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ مظلوم طبقہ کاشتکاروں کا ہے)

حضرت امام صاحبؒ کا فیصلہ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ بھی اسے جھگڑوں کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں اور اسلامی انقلاب کے دَورِ اوّل میں جن لوگوں نے مزارعت کو ناجائز قرار دیا تھا، اُن کے فعل کا سبب انہی مناقشات (جھگڑوں) کو قرار دیتے ہیں، جو مزارعت میں طبعی طور پر پیدا ہو جاتے ہیں[1]۔ اور تعاون کی صرف ان صورتوں کو جائز قرار دیتے ہیں، جن میں جھگڑے پیدا نہ ہوں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

فاصل التسبّب حیازة الاموال المباحة واستنماء

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۱۱ جلد دوم

ما اختصّ بہ بما یستمد من الاموال المباحۃ کالتناسل بالرعی والزراعۃ باصلاح الارض وسقی الماء ویشترط فی ذٰلك ان لا یضیق بعضھم علی بعض بحیث یفضی الیٰ فساد التمدن[1]۔

"یعنی معاشی وسائل کو وسیلہ کار بنانے کے لیے بنیادی اصول یہ ہے کہ جائز مال کو قبضے میں لایا جائے اور اس کو اس طرح ترقی دی جائے، جس طرح ترقی دینا جائز ہے۔ مثلاً مویشیوں کی افزائشِ نسل، آب پاشی اور اصلاحِ زمین کے ذریعے سے زراعت کرنا وغیرہ۔ لیکن اس باہمی تعاون سے معاشی وسائل حاصل کرنے کی شرطِ لازم یہ ہے کہ یہ قبضہ اور یہ حصول ترقّی معاشرۂ انسانی میں ایک دوسرے کی معاشی زندگی کی تنگی کا باعث نہ بن جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ تمدن میں فساد پیدا ہو جائے"۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا مسلک یہاں یہ امر بیان کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ ہمارے زمانے میں حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ کے مسلّم طور پر بہترین شارح حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ (پیدائش ۱۸۷۲ء؛ وفات ۱۹۴۴ء) حجۃ اللہ البالغہ کے صفحہ ۱۱۷ پر ایک حاشیے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

اعلم ان امامنا الاعظم اباحنیفۃ لایجوز

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۰۳، جلد دوم

المزارعة والجواب عن حدیث خیبر ان رسول الله صلّی الله علیه وسلّم استعمل یهود خیبر فی اراضیه علی وجه الجزیة لانّه لم یضع علیهم الجزیة غیرہ والحال ان الجزیةً کانت واجبةً بالکتاب، قال ابوبکر الرازی الحنفی وما اعطاهُ علیه السلام شطر الغلة ایّاهم کان علی وجه العطاء وَالمعاونة فی المعونة - وانا ناخذ بقول ابی حنیفةؒ لان فی الزراعة ظلمٌ وجورٌ علی العامّةِ وتسلطُ الاغنیاءِ بالظلم علی الاراضی کثیرة واستعمال العوام فیها کاستعمال الحمیر والبقر لا یرحمون علیهم ولا یعطونهم ما یکتفی بطونهم علیٰ انهم یظلمون علیهم ظلمًا لا یستطیع وصفه احدٌ واما علی تقدیر عدم الجواز فلا یُترک اراضی احدٍ تحت یدہ الا ما یقدر علیٰ حرثه"

"یعنی حضرت امامِ اعظم ابوحنیفہؒ مزارعت کو جائز نہیں رکھتے اور وہ جو خیبر کے متعلق ابورافعؓ کی روایت بیان کی جاتی ہے، تو وہ بقول ابوبکر جصّاص الرازی الحنفی بطور جزیہ تھا۔ کیونکہ اہلِ خیبر

پر اَور کوئی جزیہ نہیں لگایا گیا تھا حالانکہ قانونِ الٰہی کے مطابق ان پر جزیہ لگنا چاہیے تھا۔ اس کے باوجود حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کاشت شدہ زمین سے جو تھوڑی بہت پیداوار یہود کو دی، تو وہ بطور بخشش اَور احسان تھی۔ ہم حضرت امام ابو حنیفہؒ کے قول کے پیرو ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مزارعت میں زمیندار اَور جاگیردار مزارعوں پر سخت ظلم کرتے ہیں اَور رفتہ رفتہ بہت کثیر اراضی پر ظلماً قبضہ جما بیٹھتے ہیں اَور بے چارے عوام سے اتنا کام لیتے ہیں، کہ اُنہیں گدھوں اَور بیلوں کے درجے پر لے آتے ہیں[1] وہ ان عوام پر کوئی رحم نہیں کرتے اَور انہیں شکم سیری تک سے محروم کر دیتے ہیں۔ جاگیرداروں اَور زمینداروں کے مظالم ناقابل بیان ہیں۔ اس لیے حضرت امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کی بنا پر ایک آدمی کے قبضے میں اتنی ہی زمین رہنے دینی چاہیے، جتنی وہ خود کاشت کر سکے۔" (قلمی حاشیہ، حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم ص۱۱۱)

خیبر کے یہودیوں کے متعلق بیان مذکورہ بالا میں جو اشارہ آیا ہے، اس کی تصریح حضرت امام بخاری کی روایت کے مطابق حسبِ ذیل ہے:۔

"ان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم اعطی خیبر الیھود ان یعملوھا ویزرعوھا ولھم شطر

---

[1] حضرت مولاناؒ نے یہ جملہ حجۃ اللہ البالغہ، جلد اوّل ص۱۰۵ سے لیا ہے۔

ما یخرج منھا"

(یعنی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہودیوں کو خیبر کی زمین کاشت کے لیے دی۔ اس کی پیداوار میں سے اُنہیں بھی کچھ حصّہ دیا گیا)۔

بقول حضرت ابوبکر جصاص الرازی الحنفیؒ یہ حصّہ مزارعت کی بنا پر نہ تھا، بلکہ جزیے کی ادائیگی کی شکل ہی یہ مقرر کی گئی تھی، کہ یہود اس زمین کی کاشت کر دیں۔ لیکن حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازراہ ہمدردی و اعانت یہود کو کچھ پیداوار دے دی۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:۔

"وَ ابوحنیفة یاوّل معاملته صلی الله علیه وَسلم مع اهل خیبر بانّه' استعملهم بدلَ الجزیه وان شطر الذی دَفع الیهم کان منحةً منه صلی الله علیهِ وسلم ومعونةً لهم علی ما کلّفهم به من العمل"

(حاشیہ مشکوٰۃ المصابیح ص۲۵۷)

(یعنی امام ابوحنیفہؒ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خیبر کے ساتھ معاملے کی حقیقت یہ بیان فرماتے ہیں کہ یہ بطور جزیہ تھا اور پیداوار میں سے جو حصّہ آپؐ نے یہودیوں کو دیا، وہ مزارعت کا حصّہ نہ تھا، بلکہ کام لینے کی وجہ

سے بطورِ احسان دیا گیا)

اس حاشیے میں مندرجۂ ذیل الفاظ بھی آتے ہیں :-

ذهب ابوحنيفة الى فسادها مطلقًا والى فساد المساقات ايضًا

(یعنی حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ مزارعت اور مساقات دونوں میں فساد مطلق پایا جاتا ہے)۔

(مساقات سے مراد یہ ہے کہ حصہ داری پر باغبانی کی جائے۔ یعنی مالک کی زمین اور درخت ہوں اور مزدور کی محنت)۔

جاگیرداری اور زمینداری کا انسداد کتنی زمین ایک کاشتکار کے قبضے میں رہنی چاہیے ؛ اس سلسلے میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی وہ روایت سامنے رکھنی چاہیے، (جسے امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے روایت کیا ہے)، کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس قابلِ کاشت زمین ہو، وہ اُسے یونہی بیکار نہ چھوڑے رکھے۔ بلکہ خود کاشت کرے، ورنہ اپنے کسی بھائی کو کاشت کرنے کے لیے دیدے۔ اگر وہ نہ خود کاشت کرے، نہ کسی کو کاشت کرنے کے لیے دے، تو ساری زمین کو اپنے گھر رکھے۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں (یہ آخر الذکر فقرہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جھڑکی کے طور پر فرمایا، قابلِ غور ہے۔)

ایسے ہی ایک صحابی کو حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے کچھ زمین عطا فرمائی، لیکن وہ ساری زمین کو کاشت نہ کر سکے اور کچھ زمین بیکار پڑی رہی - حضرت عمرؓ (خلیفۂ دوم) نے باقی زمین اُن سے چھین کر حاجت مندوں میں تقسیم کر دی[1]۔

'ملکیت' کیا ہے؟ یہاں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ حضرت حکیم الامت کے نزدیک زمین کی 'ملکیت' سے کیا مراد ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ:-

الاصل فيه ما أومأنا أن الكل مال الله ليس فيه حق لاحدٍ فى الحقيقة، لكن الله تعالٰى لما اباح لهم الانتفاع بالأرض وما فيها وقعت المشاحة فكان الحكم حينئذ أن لا يهيج أحد مما سبق اليه من غير مضارة، فالأرض الميتة التى ليست فى البلاد ولا فى فنائها إذا عمّرها رجل فقد سبقت يده اليها من غير مضارة فمن حكمه أن لا يهيج عنها، والارض كلها فى الحقيقة بمنزلة مسجدٍ أو رباطٍ جُعل وقفًا على أبنا السبيل وهم شركاء فيه فيقدم الاسبق فالاسبق، ومعنى الملك فى حق الآدمى كونه أحق بالانتفاع

[1] كتاب الاموال لابى عبيد، ص ۲۹۰

من غیرہ۔ (حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم، صث۱۰۳)

(یعنی اس میں شک نہیں کہ مال سب کا سب اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اصل میں اس میں کسی کا حق نہیں ہے۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے زمین اور اُس کی پیداوار سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دے دی، تو لوگوں نے حرص اور لالچ کا اظہار شروع کر دیا (یعنی زیادہ سے زیادہ زمین پر قبضہ کرنے لگے) اس سے قاعدہ یہ بنایا گیا کہ جو شخص کسی زمین پر پہلے قبضہ کرے۔ بشرطیکہ اس سے کسی کو نقصان اور ضرر نہ پہنچتا ہو، تو اسے اس سے فائدہ اُٹھانے سے نہ ہٹایا جائے لہٰذا غیر کاشت شدہ زمین کو؟ جو شہر اور اس کے مضافات میں نہ ہو، جو شخص پہلے کاشت کرے، بشرطیکہ اس سے کسی کو نقصان نہ پہنچتا ہو، تو اس کا حکم یہی ہے، کہ اسے اس سے نہ ہٹایا جائے۔ ساری زمین حقیقت میں مسجد یا سرائے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ دونوں آنے جانے والوں پر وقف ہیں اور سب لوگ ان میں برابر کے شریک۔ مگر جو پہلے آکر قبضہ کرلے، وہ اسی کی ہو جاتی ہے۔ (لیکن ظاہر ہے کہ کوئی شخص اتنی ہی جگہ پر قبضہ کرنے کا حق رکھتا ہے، جتنی جگہ پر وہ بیٹھے)۔ ایسے ہی زمین پر کسی آدمی کے قبضے کے صرف یہ معنی ہیں کہ وہ دوسرے شخص کی بہ نسبت اس قطعۂ زمین سے فائدہ اُٹھانے کا فائق حق رکھتا ہے۔)

حضرت فاروقِ اعظمؓ کا فیصلہ اس سلسلے میں تقسیم اراضی کے متعلق حضرت فاروقِ اعظمؓ (خلیفۂ دوم) کا وہ فیصلہ بھی سامنے رکھنا چاہیے، جو اُنہوں نے عراق کی اراضی کے متعلق کیا اور جس کا تفصیلی ذکر حضرت حکیم الملت نے اپنی نادر تصنیف ازالۃ الخفاء (مقصد دوم، ص۱۲۷) میں کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ عراق کا ملک فتح ہُوا، تو حضرت عمرؓ نے فرمان بھیجا، کہ یہ اراضی مسلمانوں میں تقسیم نہ کی جائیں، بلکہ عراقی کاشتکاروں کے پاس ہی رہنے دی جائیں۔ لیکن مدینہ کے بعض لوگوں نے اصرار کیا کہ، یہ اراضی تقسیم کر دی جائیں۔ عرصے تک بحث ہوتی رہی۔ آخر حضرت عمر فاروقؓ کو قرآن حکیم سے استدلال سُوجھ گیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ اراضی ان لوگوں کے لئے بھی ہیں، جو بعد میں آئیں، اس سے حضرت فاروقِ اعظمؓ نے قرار دیا کہ یہ تقسیم نہیں ہونی چاہئیں۔ چنانچہ سب اہل رائے نے اس رائے کو قبول کر لیا اور عراق اور شام کی اراضی ناقابلِ تقسیم قرار پائیں اور اس کی آمدنی غربا و مساکین وغیرہ کے لیے مقرر رہی۔

امام عبدالعزیزؒ کا فتویٰ برعظیم پاک و ہند میں جاگیرداری اور زمینداری کو روکنے کے لیے حضرت حکیم الملت کے خیالات اُوپر بیان کیے جا چکے ہیں۔ اب ہم اُن کے نامور فرزند امام عبدالعزیزؒ کے خیالات

پیش کر کے اس مسئلے کو ختم کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ:-

وحضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہٗ العزیز رسالہ "در احکامِ اراضی ہند" قلمی فرمودہ اند دراں رسالہ این مذہب را بشواہد و دلائل بسیار ابطال فرمودہ تحقیق فرمودہ اند کہ اراضی ہند بدستور اراضی سوادِ عراق موقوف بر ملکِ عامۂ مسلمین بے تخصیص است یعنی در ملکِ بیت المال است و زمینداران را بیش از قیّم بودن دخلے نیست و قاضی محمد اعلیٰ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نیز دریں باب رسالہ نوشتہ و ہمیں مسلک را ترجیح دادہ الخ

مگر بنا بر آنچہ حضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہٗ در رسالۂ خود اختیار فرمودہ اند کہ زمین ہندوستان در ابتدائے فتح مانند سوادِ عراق کہ در عہدِ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ مفتوح شدہ بود موقوف بر ملک بیت المال ست و زمینداران را بیش از تولیت و داروغگی تردد و فراہم آوردن مزارعین و اعانت در زراعت و حفظ دخلے نیست چنانچہ لفظ زمیندار نیز اشعارے باں میکند و تغیر و تبدّل زمینداری و عزل و نصب زمینداران و اخراج بعضے از آنہا و اقرار بعضے و عطائے بعضے اراضی با فغانان و بلوچان و سادات و قدوائیاں بصیغہ زمینداری دلالتِ صریحہ بریں میکند الخ[1]

[1] فتاویٰ عزیزی، جلدِ اوّل، ص ۱۳۳، طبع مجتبائی

ریعنی " اور حضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہ العزیز نے ایک رسالہ اراضیِ ہند کے بارے میں لکھا ہے - اس رسالے میں اُنہوں نے اس مذہب کو (کہ ہند میں زمین زمینداروں کی مِلک ہیں) بہت سے دلائل وشواہد سے باطل قرار دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ہند کی اراضی آج بھی بدستورِ سابق عراق کی اراضی کی طرح عامۂ مسلمین کے لیے وقف ہیں یعنی بیت المال کی ملکیت ہیں۔ کسی شخص وفرد کی ملکیت نہیں اور نہ زمینداروں کی ملکیت اور نہ زمینداروں کو چودھری اور نگران ہونے سے زیادہ کوئی دخل ہے - اور قاضی محمد اعلیٰ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس بارے میں ایک رسالہ تصنیف کیا ہے اور اُنہوں نے اس میں شیخ جلال رح ہی کے مسلک کو ترجیح دی ہے - اس مسلک کی بنیاد پر جو حضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہ نے اپنے رسالے میں اختیار فرمایا کہ ہند کی زمین ابتدائے فتح میں عراق کی طرح (جو حضرت فاروق رض کے زمانہ میں فتح ہوا تھا) "بیت المال" ہی کی مِلک ہے اور زمینداروں کو اس کے سوا کہ وہ اس کے متولی اور داروغہ ہیں اور کاشتکاروں کی تلاش کرکے زمین دینے اور زراعت میں اعانت پہنچانے اور اسی ذمہ داری کے غوروفکر میں رہنے کے اور کوئی حق حاصل نہیں ہے اور نہ ان کی ملکیت میں کوئی دخل ہے - چنانچہ لفظ زمیندار بھی اِسی کی خبر دیتا ہے اور زمینداری میں تغیر وتبدل اور عزل ونصب اور بعض کا اخراج اور

بعض کے لیے اثبات اور بعض کو داد و دہش مثلاً افغان، بلوچ، سادات، مشائخ وغیرہ کو زمینداری کے اصول پر زمینیں دینا اس دعویٰ کی صریح تاکید کرتے ہیں۔")

کانیں حکومت کے قبضے میں | کانوں کے متعلق حضرت امام کا قول یہ ہے کہ:-

لاشك أن المعدن الظاهر الذی لا يحتاج الیٰ كثير عمل إقطاعه لواحد من المسلمين إضرار بهم وتضييق عليهم (حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم، ص ۱۰۴)

یعنی اس میں شک نہیں کہ جو کانیں سطح زمین سے اس طرح وابستہ ہوں کہ وہ زیادہ محنت و مشقت کی محتاج نہ ہوں۔ اُن کا کسی ایک مسلمان کو بخش دینا عامۂ مسلمین کے لیے نقصان رساں ہے اور ان کی ضروریات کے لیے تنگی کا باعث ہے۔ اس لیے ایسا کرنا منع ہے۔"

دوسری قسم کی کانوں کا فیصلہ حکومت کی رائے پر ہے، کہ وہ مناسب سمجھے، تو اپنی نگرانی میں ان سے کام لے اور مناسب سمجھے، تو اجتماعی طور پر فائدہ اُٹھانے کی اجازت دے دے۔ بہرکیف اس اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے گا، کہ سوسائٹی میں سرمایہ پرستی نہ ہو اور دولت چھوٹے سے طبقے ہی میں گھومتی نہ رہے اور مفادِ عامہ کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچے +

مزدور اور سرمایہ دار کا جھگڑا | جہاں تک مزدور اور سرمایہ دار کے جھگڑے

کا تعلق ہے حضرت امامؒ کا فیصلہ صاف ہے اور وہ یہ کہ :-

ان كان استنماء فيها ليس لهٗ دخل فى التعاون او بما هو تراضٍ يشبه الاقتضاب فليس من العقود المرضيه ولا الاسباب الصالحة وانما هو باطل وسحت بأصل الحكمة المدينة"

(حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم، ص۱۰۳)

"(یعنی اگر مال بڑھانے میں تعاون کو دخل نہ ہو یا ایسی رضامندی ہو، جس میں جبر پایا جائے، تو اس قسم کے معاملات ناپسندیدہ اور غیر صالحہ ہیں۔ یہ اجتماعی زندگی کے اصول کے لحاظ سے باطل اور گناہ ہیں")

یہ فیصلے کرنا حکومت کا کام ہے کہ اس قسم کے معاہدات میں عدل قائم کرے۔ کیونکہ قانون کی رُو سے ہر قسم کے نرخ مقرر کرنے کا اُسے ہی حق حاصل ہے[1]۔

غرض حکیم الملّت کے نزدیک اصول یہ ہے، کہ انفرادی ملکیت اسی حد تک جائز ہے، کہ وہ مفادِ عامّہ کے خلاف نہ ہو۔ اجتماعی مفادات سے تصادم ہو، تو اجتماعی مفادات فائق رہیں گے۔

[1] در مختار مع شامی، جلد ۵، باب الحظر والاباحۃ۔

پانچواں باب

ارتفاقِ سوم

یعنی

ثقافت کی تیسری منزل: شہری یا قومی زندگی

شہر کیا ہے؟ جب معاشرۂ انسانی میں لوگوں کو آپس کے معاملات میں حصّہ لینا پڑا، ہر شخص کسی نہ کسی پیشے کو خصوصیت سے اختیار کر بیٹھا اور اس وجہ سے اپنی ضرورتیں اُسی پیشے کے ذریعے سے پوری کرنے پر مجبور ہوگیا، لوگوں کو ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت پڑی اور اُنھوں نے آپس میں مبادلہ اور تعاون شروع کیا، تو کسانوں، تاجروں اور اہلِ حرفہ کے مابین ایک ربط پیدا ہوگیا، جس سے شہر بن گیا۔ بقول امام ولی اللہ دہلویؒ شہر سے مراد فصیل، بازار

اور قلعے نہیں ہیں۔ بلکہ شہر ایک وحدت کا نام ہے، جس میں مختلف جماعتوں کے درمیان خاص ربط و ارتباط ہوتا ہے اور وہ سب گویا اس وحدت کے اعضاء و جوارح ہوتے ہیں[1]۔

میونسپل بورڈ کی ضرورت: اس وحدت کے اعضا میں یگانگت، ہم آہنگی اور توافق کی ضرورت ہے، جس سے اس کی صحت قائم رہے۔ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ کے نزدیک اس وحدت کا مرکز "امام" کہلاتا ہے۔ اُن کے نزدیک اس امام سے مُراد بھی ایک فرد انسانی نہیں ہے، بلکہ وہ ادارۂ تدبیر (Organisation) مراد ہے، جو وحدت قائم رکھ سکے اور جس کے ذریعے سے شہری اجتماع سے حاصل ہوسکنے والے فوائد حاصل ہوتے رہیں[2]۔

حضرت امامؒ کے نزدیک شہر کا مرکزی نظام عوام کی خدمت اور فائدے کے لیے ہے، نہ کہ عوام اس نظام کے لیے[3]۔ اس سلسلے میں وہ کسی استبداد کو جائز نہیں سمجھتے اور قرار دیتے ہیں کہ اس قسم کے ہر نظام پر مصلحۃ کلیہ (Public Weal) حاکم ہونی چاہیے[4]۔

میونسپل بورڈ کے فرائض: حضرت امام شہر کی مندرجۂ ذیل ضرورتیں معین فرماتے ہیں:۔

(۱) قضاء (Judiciary) شہر میں لین دین اور معاملات ہوں گے،

---

[1] بدور بازغہ: ص۶۰۔ [2] بدور بازغہ، ص۷۰۔ [3] حجۃ اللہ البالغہ، جلد اوّل ص۲۶۔ [4] ایضاً۔

ان کے نمٹانے کے لیے محکمۂ قضا کی ضرورت ہے +

(۲) شہر یاریت (Executive) شہر میں امن قائم رکھنے اور فسادات کو روکنے کے لیے اس نظام کی ضرورت ہے - یہ نظام ایسا ہونا چاہیے، کہ اس کی ہیبت سے لوگ قانون کی خلاف ورزی سے رُکے رہیں - اس کے باوجود شہریار کا فرض ہے، کہ وہ تمام شہریوں کو اپنی اولاد سمجھے اور اُن کے حق میں وہی بات پسند کرے، جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے - بلکہ اہلِ شہر کو متقدم رکھے +

(۳) نظامِ حربی (Military) بعض لوگ قتل اور لوٹ مار پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات گروہ بنا کر ڈاکہ زنی کرنے لگتے ہیں - کبھی مذہبی اختلافات کی وجہ سے شہر میں فسادات ہو جاتے ہیں - ان ہر قسم کے فسادات کا سدِ باب فوجی طاقت سے کیا جائے +

(۴) رفاہِ عامّہ (Public Weal) شہری زندگی، جیسے اُوپر بیان کیا جا چکا ہے، مختلف جماعتوں کے باہمی ربط سے پیدا ہوتی ہے - اس زندگی کا ظہور مختلف رفاہی کاموں کی صورت میں ہوتا ہے - جیسے فصیلوں کی تعمیر، بازاروں کی تعمیر، پُلوں اور نہروں کی کی تعمیر - یتیموں اور بیواؤں کی شادی اور اُن کے اموال کی حفاظت، صدقات کو مستحق لوگوں میں تقسیم کرنا اور وارثوں کو ترکہ پہنچانا - ان کاموں میں جو روپیہ صرف ہو، اس کا حساب کتاب

رکھنا وغیرہ۔ اس محکمے کا کام ہے +

یہ محکمہ بھی نہایت عدل و انصاف سے کام لے گا اور لوگوں کے صحیح حالات سے باخبر رہے گا۔ جب کوئی شخص مر جائے، تو اُس محکمے کے صدر یا نقیب کا فرض ہوگا، کہ اس کے ترکے کو ضائع ہونے سے بچائے۔ کیونکہ یہ ترکہ پسماندگان کی معاش کے قوام کا باعث ہے۔ یہ ترکہ میت کے پسماندگان میں دو لحاظ سے تقسیم کیا جائے۔ ایک تو یہ کہ کون لوگ میت کے قریبی معاون و مددگار اور اس کی زندگی میں سب سے زیادہ نفع رساں رہے۔ جنہیں دے کر اور جن سے لے کر وہ خوش ہوتا تھا اور جن کے ساتھ مالی مبادلہ کیا کرتا تھا۔ دوسرے یہ فرض کر لیا جائے، کہ اگر میت زندہ ہوتا اور کوئی شخص اُسے نہ روکتا تو وہ یہ مال کسے دیتا اور کسے اور لوگوں پہ ترجیح دیتا کیونکہ مال تو اصل میں میت ہی کا ہے۔ اسی لیے اُسی کا فیصلہ تقسیم میں قطعی ہو سکتا ہے۔ علاوہ بریں میت کے جو اقرباء اس کے مال کے طبعی طور پر حقدار ہیں، اگر انہیں مال نہ پہنچے گا، تو ان میں عداوت کے جذبات پیدا ہو جائینگے اس اصول کے مطابق اجمالی طور پر کہا جا سکتا ہے، کہ میت کے مال کا سب سے پہلے اس کا بیٹا حقدار ہے۔ پھر بھائی اور بیوی وغیرہ +

شہر میں جو مساکین ہوں اور وہ کام کاج نہ کر سکتے ہوں (خواہ اس وجہ سے کہ وہ کر ہی نہیں سکتے، یا اس وجہ سے کہ اُن کے پاس ذرائع نہیں ہیں)، ان کا انتظام کرنا بھی اسی سر رشتے کا فرض ہے۔ کیونکہ اوّل تو انسان کا خلقِ سیر چشمی (سماحت) اس کا متقاضی ہے۔ دوسرے خودِ شہر کا نفع اس میں ہے کہ کوئی باشندہ بے کار نہ رہے +

شہری زندگی کی حفاظت کا بہترین ذریعہ یہ ہے، کہ ایسی عمارات بنائی جائیں، جن سے عام اہلِ شہر فائدہ اُٹھا سکیں۔ گویا حضرت امامؒ کے نزدیک اشتراک فی الانتفاع (نفع اور فائدے میں سب اہلِ شہر کا شریک ہونا) شہری زندگی میں ربط قائم کرنے کی بہترین شکل ہے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ رفاہِ عامہ کے کام (General Utility Services) حکومت کے ہاتھوں میں ہوں +

(۵) محکمۂ احتساب (Censorship) گندی طبیعت کے لوگ لذات اور شہوات سے مغلوب ہو کر حق کی مخالفت کرنے لگ جاتے ہیں، اس لیے ضروری ہے، کہ حکمت کی اشاعت کرنے والے لوگ ہوں اور دین سکھانے والے معلّم ہوں، جو شہر کے اخلاق کی نگرانی کریں۔ یہ محکمہ لوگوں کو اخلاق سکھائے گا، تاکہ ان کے نظامِ خانگی اور شہری زندگی کی اصلاح ہو اور ان کو تقرب الی اللہ

کے طریقے تعلیم کرے گا تاکہ ان کی آخرت درست ہو۔

یہ سب باتیں ایک ہی شخص میں نہیں پائی جاسکتیں۔ اس لیے کئی آدمی مل کر انتظام کریں۔ جن میں سے ایک ایک آدمی ایک ایک محکمے کی نگرانی کرے۔ یہ امامِ شہر کے اعوان (مددگار) ہوں گے۔

جو جماعت شہر کا نظم و نسق چلائے، اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے، کہ وہ اپنی مملکت کے اندر خفیہ سیاسی جماعتوں کا خاص خیال رکھے اور اگر ضرورت سمجھے، تو ان کو بالکل فنا کر دے[1]۔ اس کا یہ بھی فرض ہے کہ جو لوگ نظامِ حکومت چلانے میں مدد دیں مثلاً ملازمین یا اعزازی کارکن، اُن کی مالی مدد کرتی رہے اور ان کی حوصلہ افزائی کرے اور جو لوگ اچھی طرح کام نہ کریں، ان کی گوشمالی کرے۔

نظامِ شہر کی تکمیل کے لیے سلسلہ جاسوسی (Intelligence) بھی ضروری ہے۔ جس سے مملکت کی اندرونی کیفیت اور دشمن کی فساد انگیز حرکات کا علم حاصل ہوتا رہے۔ ایسے ہی دشمن ممالک کی تیاریوں کے حالات بھی ان جاسوسوں کے ذریعے سے معلوم کیے جاسکتے ہیں[2]۔

ٹیکسوں کی ضرورت | چونکہ امام اور اُس کے اعوان جو ان محکموں میں کام کریں گے، سب کے سب پبلک ملازم (Public Servants) ہوں گے

---

[1] بدور بازغہ ص۷۔ [2] بدور بازغہ ص۷۹۔

اور شہر کی فلاح و بہبود کی خاطر کام کریں گے[۱]۔ اس لیے حضرت امام صاحبؒ تجویز کرتے ہیں، کہ ان کی ضرورتیں پوری کرنا اہل شہر کے ذمہ ہے اور انہیں یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ لوگوں سے بیگاریں یا ان پر تاوان لگا کر اپنی ضرورتیں پوری کریں۔ بلکہ ان کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے اہل شہر پر ٹیکس لگائے جائیں گے اور تمام ٹیکس مالداروں سے لیے جائیں گے اور ان اموال میں سے لیے جائیں گے، جو بڑھتے ہیں، جیسے مویشی، زراعت و تجارت وغیرہ +

شہروں کی دو قسمیں حضرت امام صاحبؒ کے نزدیک شہروں کی دو قسمیں ہیں:-

(۱) کامل شہر

(۲) ناقص شہر

اُن کے نزدیک کامل شہر وہ ہے، جس میں سے کم از کم چار ہزار فوج بھرتی ہوسکے اور شہر میں ایک تعداد کاشتکاروں اور نوربافوں وغیرہ کی بھی ہو، جن سے ارتفاقِ دوم پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے +

ناقص شہر وہ ہے، جس میں سے چار ہزار سے کم تعداد میں فوج بھرتی ہوسکے۔ ایسے قصبوں میں عموماً ایک ہی طرز کے لوگ بستے ہیں +

(نوٹ: فوجیوں کی یہ تعداد اٹھارویں صدی کے طریق جنگ

---

[۱] حضرت امامؒ نے ان کے لیے خصوصیت سے لفظ اجیر استعمال کیا ہے، جس کے معنی ہیں اُجرت پر کام کرنے والا۔ (بدور بازغہ، صفحہ ۵۵)۔

کے مطابق تھی۔ اب اس میں حسب ضرورت اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

نظام شہر چلانے والے لوگوں میں حکمت، عفت، سماحت، یعنی سیر چشمی، شجاعت، فصاحت، دیانت اور اخلاقِ صالحہ ہونے ضروری ہیں۔ ورنہ وہ شہر پر بارِ گراں ثابت ہوں گے اور شہر کا نظم و نسق ان کے لیے وبالِ جان بن جائے گا۔

حکومتِ خود اختیاری کی تین شکلیں: اوپر بیان کیا جا چکا ہے، کہ امام صاحبؒ کے نزدیک شہر کا نظام چلانے والا نظام (تدبیر) ہی اصل میں (امام) ہے نہ کہ کوئی انسانی فرد۔ اس سے ظاہر ہے کہ امام صاحبؒ کسی قسم کے شخصی استبداد (Autocracy) کو جائز نہیں رکھتے۔ چنانچہ شہری نظام چلانے کے لیے حضرت امام صاحبؒ تین شکلیں بیان کرتے ہیں[1]:۔

(۱) رسم کی پابندی: یہ اُس وقت ہو سکتا ہے، جب قصبہ چھوٹا ہو اور ایک ہی طرز کے لوگ بستے ہوں۔ یہ پنچایت کی شکل بن جاتی ہے۔

(۲) چودھراہٹ: یعنی ایک پیشے کے لوگ اپنے اپنے چودھری کے ماتحت رہیں۔ یہ گلڈزم (Guildism) کی شکل ہے۔

(۳) اجتماعِ عقلاءِ قوم و مبرزین: یعنی پارلیمنٹ (Parliament) یعنی شہر کے حکما اور اپنے اپنے پیشے یا کام میں خاص نمود اور بزرگی کے مالک لوگ۔

یہ تینوں شکلیں قومی حکومت تک ہیں۔ اور ان میں تشاور

---

[1] بدور بازغہ ص۲۳۔

(Mutual Consultation) سے کام کیا جائے گا۔

شہری زندگی کی خرابی کے اسباب

عام اسباب ارتفاقِ سوم کی بحث کے دوران میں بیان کیا جا چکا ہے کہ شہر عبارت ہے، اُس ربط سے، جو ایک رقبے میں بسنے والی جماعتوں کے درمیان معاملات و مبادلات وغیرہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ یہ زندگی مختلف اجزا اور عناصر سے مرکّب ہوتی ہے، اس لیے اجزاء ترکیبی میں عدمِ موافقت پیدا ہو جانے سے شہری نظام میں خرابی پیدا ہو سکتی ہے۔

حضرت امام کے نزدیک شہری زندگی کی خرابی کے عمومی اسباب حسب ذیل ہیں :-

(۱) **مذہبی اختلافات** : یہ شہری زندگی میں خطرناک فتنہ وفساد کا باعث بن جاتے ہیں۔ ان کا علاج یہ ہے، کہ جو لوگ مذہب کے صحیح حقائق پر ناجائز اعتراضات کریں، ان کا سدِّ باب کیا جائے۔

(۲) **خفیہ وسیسہ کاریاں** : بعض لوگ شہری زندگی کو اپنی خفیہ مضر حرکات سے نقصان پہنچاتے ہیں۔ مثلاً زہر خورانی، سوسائٹی کے خلاف تعلیم، نظامِ حکومت کے خلاف پوشیدہ تحریک، مرد کو عورت سے اور بیوی کو شوہر سے بدظن کرنا وغیرہ۔

(۳) **اجتماعِ اشرار** : کبھی شریر لوگ اجتماع کرکے ڈاکہ زنی اور چوری چکاری شروع کر دیتے ہیں۔

(۴) **قتل و غارت کی وارداتیں:** کبھی بعض لوگ ظلم و جور پر اتنے اُتر آتے ہیں، کہ دوسرے لوگوں کو قتل و مجروح کرنے لگ جاتے ہیں۔ یا ان کی بہو بیٹیوں کا اغوا شروع کر دیتے ہیں یا شرفا کو بدنام کرنے لگتے ہیں۔ ان سے گالی گلوچ پر اُتر آتے ہیں۔ اس سے بھی معاشرے میں خلل واقع ہوتا ہے۔

(۵) **عاداتِ فاسدہ کا ظہور:** بعض لوگوں میں خلافِ فطرت عادات کا ظہور ہوتا ہے۔ جن سے ارتفاق کو نقصان پہنچتا ہے مثلاً صدومت (Sodomy) جس میں فطرتِ انسانی کا بگاڑ ہے۔ کیونکہ مرد عورت سے مقاربت کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ نہ اس لیے کہ کوئی مرد اس سے مقاربت کرے۔ اس حرکت سے نسلِ انسانی برباد ہوتی ہے اور نکاح کے ارتفاق سے بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے اور یہ معاشرۂ انسانی کی تباہی کا باعث ہوتی ہے۔ کیونکہ معاشرۂ انسانی کی ترقی کے لیے گھر بمنزلہ اکائی کے ہے، جس کی بنیاد مرد اور عورت کے متوازن عادلانہ تعلقات پر ہے۔ اگر مرد اور عورت کے تعلقات ٹوٹ جائیں، اور مردوں کو آپس میں جذبۂ جنسی کی تسکین کی اجازت دے دی جائے، تو خانگی زندگی پیدا ہی نہیں ہو سکتی، جو معاشرۂ انسانی کی بنیاد ہے[۱]۔

ایسے ہی زنا ہے۔ جس میں ایک مرد بلا تعیینِ زوجہ دوسری

---

[۱] بیسویں صدی کی بہت بڑی حکومت، سلطنت برطانیہ نے جولائی ۱۹۶۷ء میں صدومت کو قانونی طور پر جائز قرار دے لیا۔ اس قانون کی حمایت کلیسائے برطانیہ (Anglican Church) اور رومن کیتھولک کلیسا (Roman Catholic Church) دونوں نے کی۔

عورت کے پاس جاتا ہے۔ حالانکہ کوئی انسان برداشت نہیں کر سکتا، کہ کوئی غیر شخص اس کی بیوی یا بیٹی وغیرہ کے پاس آئے۔ یہ حرکت خلافِ فطرتِ انسانی ہے۔ نیز اس کے سبب سے معاشرۂ انسانی میں جنگ و جدال اور قتل و قتال تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور نسب کا تعیین مشکل ہو جاتا ہے۔ جس سے آگے چل کر قانونی مالی اور اقتصادی معاملات اور ذمہ داریوں میں خلل پڑتا ہے علاوہ بریں اگر زنا عام کر دیا جائے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے، کہ تعیین زوجہ نہیں ہے۔ حالانکہ یہ ارتفاقِ دوم چھوڑ ارتفاقِ اوّل کی چیز ہے۔ جس سے انسان نے اپنی معاشرت کا آغاز کیا اور جو اب تک فطرتِ انسانی کی ترجمان تسلیم کی جاتی ہے۔

ایسا ہی حیوانات سے بدفعلی کرنا خلاف فطرت ہے اس سے بھی معاشرۂ انسانی میں خلل و فساد پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھی فطرتِ سلیمہ کے خلاف ہے۔

ایسے ہی عورتوں کا مرد بننا یا مردوں کا زنانہ پن اختیار کرنا معاشرۂ انسانی کے اصول کے خلاف ہے۔ مرد مردانہ صفات کے

ساتھ پیدا کیے گئے ہیں اور معاشرۂ انسانی میں ارتفاقِ اوّل سے ارتفاقِ سوم تک ان کے کاموں کی تخصیص ہو چکی ہے اور عورت ایسی عادتوں کے ساتھ پیدا کی گئی ہے، جس میں حیا اور شرم اور ستر کو لازم قرار دیا جا چکا ہے۔ اس لیے مردوں کا عورتوں کے سے کام کرنا اور عورتوں کا مردانہ حلقۂ فرائض میں دخل دینا معاشرۂ انسانی کے لیے مضر ہے +

ایسے ہی شراب نوشی اور نشہ بازی بھی سوسائٹی کے لیے مضر ہیں۔ کیونکہ ان سے عقل میں فتور آتا ہے اور انسان ذمہ داری کے کام کرنے سے عاجز آ جاتا ہے +

(۶) **ضرر رساں معاملات:** مثلاً جوا بازی، سُود خوری اور رشوت ستانی، کم ماپ تول، مالِ تجارت میں فریب، مثلاً کھوٹ ملانا۔ نیز مالِ تجارت خصوصاً گیہوں کو روک رکھنا، تاکہ مہنگا بیچنے کا موقعہ ملے اور کسی چیز کی، جسے خریدنے کی نیت نہ ہو، بولی دے کر قیمت بڑھا دینا، مثلاً سٹہ بازی وغیرہ۔ ان سب سے معاشرۂ انسانی میں نہایت بُرا خلل واقع ہوتا ہے +

(۷) **مشتبہ مقدمات:** بعض لوگ ایسے جھوٹے مقدمے بناتے ہیں اور ان میں ایسی جعلسازی کرتے ہیں، کہ ان میں حق بات کا معین کرنا سخت مشکل ہوتا ہے۔ ایسی حرکات سے بھی انسانی سوسائٹی کو نقصان پہنچتا ہے اور امن اُٹھ جاتا ہے۔ (امریکہ اور انگلستان کے

مالی حلقوں میں اس قسم کی حرکات کثرت سے ہوتی ہیں اور اکثر اوقات بڑے بڑے لکھ پتی سوداگر منٹوں میں تباہ ہوجاتے ہیں۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ "اسرائیل" و اقوامِ عرب کے دوران میں اسرائیل (یہودی مملکت) نے جسے امریکہ اور برطانیہ نے جبراً عرب ممالک پر ٹھونسا تھا، ایک دستاویز جعلی طور پر بنا کر اپنا حقوقِ قیام ثابت کرنے کی کوشش کی۔ گویا اب جعلسازی افراد سے گزر کر اقوام تک آ پہنچی ہے (جولائی ۱۹۷۱ء)۔

(۸) بدوی زندگی اختیار کرنا: بعض اوقات شہر کے باشندے بدوی زندگی کی طرف رجوع کر لیتے ہیں اور ارتفاقِ اوّل کے اصول کو اختیار کر لیتے ہیں یا ایک شہر کو چھوڑ کر دوسرے شہر میں چلے جاتے ہیں۔ اس سے بھی شہر برباد ہوجاتے ہیں یا کم سے کم شہری زندگی کو نقصان پہنچتا ہے۔

(۹) پیشوں کی غلط تقسیم: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں میں پیشوں کی غلط تقسیم ہوجاتی ہے۔ مثلاً اکثر لوگ تجارت کی طرف اُمنڈ پڑتے ہیں اور زراعت کو چھوڑ بیٹھتے ہیں یا فوجی ملازمت کی طرف ضرورت سے زیادہ رجحان ہوجاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک زرعی ملک میں اہلِ زراعت کی کثرت ہونی چاہیے اور صنّاعوں اور تاجروں وغیرہ کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہونی چاہیے[1]۔

(۱۰) بعض اوقات لوگ اصولی پیشوں کو چھوڑ کر جن پر نظامِ ثقافت کی بنا ہے، مثلاً زراعت، تجارت، صنّاعی وغیرہ، ایسے پیشے اختیار کر لیتے ہیں، جو رفاہیتِ بالغہ اور تکلّفِ لایعنی پر مبنی ہوتے ہیں[2] جیسے پُرتکلّف ریشمی لباس تیار کرنا، سونے چاندی کے برتن تیار کرنا حُسنِ کلام کے پیچھے پڑ جانا۔ مثلاً بجائے اس کے کہ گیہوں کی کاشت میں اصلاح و اضافہ کی کوشش کی

---

[1] انما ینبغی ان یکون الزُّرّاع بمنزلة الطعام والصُّنّاع والتجّار والحفظة بمنزلة الملح المصلح له حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱، ص ۱۰۴۔ [2] ایضاً ص ۱۰۶۔

جائے۔ گلاب کے پھولوں کے نئے رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔ ان "فنون" میں انہماک پیدا ہو جانے سے سوسائٹی کے اصلی کام رک جاتے ہیں یا ان میں ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔

(۱۱) مُضر حیوانات کی کثرت: بعض اوقات شہر میں حفظِ صحت کے اصول پر پوری پوری پابندی نہ ہونے کے باعث مضر کیڑے مکوڑے یا ضرر رساں حیوانات اور حشرات الارض بڑھ جاتے ہیں۔ اس سے بھی شہری زندگی میں خلل پڑتا ہے۔ مثلاً مکھیوں، مچھروں اور بچھوؤں کی کثرت۔ کتوں اور چوہوں کی کثرت انہیں فنا کرنے اور ضبط میں رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

سب سے بڑے اسباب | یہ عام اسباب ہیں، جن سے انسانی سوسائٹی میں خلل اور نقص واقع ہو جاتا ہے۔ ان اسباب کی تفصیل بیان کرنے کے بعد حضرت امام فرماتے ہیں:۔

وغالبُ سببِ خرابِ البلدانِ فی ھذا الزمانِ شیئان:

احدھما تضییقھم علی بیت المال بأن یعتادوا التکسب بالاخذ منه علی انھم من الغزاۃ او من العلماء الذین لھم حق فیه او من الذین جرت عادۃ الملوك بصلتھم کالزھاد والشعراء او بوجهٍ من وجوہ التکدی ویکون العمدۃ عندھم ھو التکسب دون القیام بالمصلحة فیدخل قوم علی قوم فینغصون علیھم ویصیرون کلاً علی المدینة۔

والثانی ضرب الضرائب الثقیلة علی الزراع والتجار والمتحرفة والتشدید علیھم حتی یفضی الی اجحاف المطاوعین واستئصالھم والی تمنع

أولی بأسٍ شدیدٍ وبغیہم + (حجۃ اللہ البالغہ، جلد اوّل ص۴۵)

(یعنی "ہمارے زمانے میں شہروں کی تباہی اور شہری زندگی کی خرابی کے دو بڑے سبب ہیں :-

(۱) اکثر لوگ شہر کی مفید خدمت کیے بغیر پبلک فنڈ سے یوں ہی روپیہ بٹورنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً کبھی وہ فوجی خدمات کے عوض میں، کبھی بلند مرتبے کے صدقے میں، کبھی زہد و عبادت کے زور پر، کبھی شعر و شاعری کی بدولت وظیفہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کوئی ذریعہ نہ ہو، تو مانگنے ہی لگ جاتے ہیں۔ بعض عہدے دار اپنے عہدے کے فرائض سرانجام نہیں دیتے اور خواہ مخواہ تنخواہیں پاتے ہیں۔ جب ایسے لوگوں کی تعداد سوسائٹی میں بڑھ جاتی ہے، تو وہ ایک دوسرے کے لیے تنگی کا باعث بن جاتے ہیں +

(۲) دوسرا سبب یہ ہے کہ کاشتکاروں، تاجروں اور اہلِ حرفہ پر بہت گراں بار ٹیکس لگا دیے جاتے ہیں اور ان کی وصولی میں نہایت سختی سے کام لیا جاتا ہے یہاں تک کہ جو کمزور لوگ ٹیکس ادا کرتے رہتے ہیں، وہ تو رفتہ رفتہ تباہ حال ہو جاتے ہیں اور جو ذرا طاقتور ہوتے ہیں، وہ سرکشی اختیار کر لیتے ہیں")

آگے چل کر حضرت امام فرماتے ہیں کہ :-

انما تصلح المدینۃ بالجبایۃِ الیسیرۃِ و اقامۃِ الحفظۃِ بقدر الضرورۃ، فلیتنبہ اھل الزمان لھذہ النکتۃ +

(حجۃ اللہ البالغہ، جلد اوّل، ص۴۵)

یعنی "شہری زندگی کی بہبود اس میں ہے کہ ٹیکس ہلکے ہوں اور ملازمین (مثلاً پولیس، فوج، سول محکموں کے کارکن) بقدر ضرورت ہوں۔ ہمارے زمانے کے لوگ اس باریک بات کو اچھی طرح سمجھ لیں"۔+

اجتماعی خرابی کے اسباب | حضرت امامؒ اجتماعِ انسانی کی خرابی کے اسباب پر بھی بحث کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ سب سے زیادہ زور اقتصادی عدم توازن پر دیتے ہیں چنانچہ وہ فسادِ تمدّن (Corruption of Civilisation) کو امرا کی نفس پرستیوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، جو سادگی اور بے تکلّفی کی زندگی چھوڑ کر جس کے بغیر انسان کا گزارہ نہیں ہو سکتا، تکلّفات اختیار کر لیتے ہیں اور عوام امراء کی نفسانی خواہشوں کی تکمیل کے لیے ویسے ہی پیشے اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بعض لوگ تو حسین وجمیل دوشیزہ لڑکیوں کو رقص وسرود اور بدن کی لذت آفریں حرکات کی تعلیم دینے کے لیے درسگاہیں کھول لیتے ہیں۔ بعض رنگ برنگ اور نئی وضع قطع کے لباس تیار کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ بعض خوش نما اور دلفریب طلائی و نقرئی زیورات تیار کرنے میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ ایک گروہ بلند عالیشان مکان تعمیر کرنے اور ان میں دلفریب بعض اوقات شہوتناک نقش و نگار کرنے میں تخصیص پیدا کر لیتا ہے۔ جب ملک کی اکثریت ان لغو اور بیہودہ پیشوں کی طرف مائل ہو جاتی ہے، تمدن کے بنیادی پیشے (Basic Occupations) مثلاً تجارت، زراعت اور ضروری صنعت وحرفت برباد ہو جاتے ہیں اور جو تھوڑے سے لوگ ان اصلی ضروری تمدنی پیشوں کو اختیار کیے رہتے ہیں، ان پر ناقابلِ برداشت ٹیکس (ضرائب شدیدہ) لگا دیے جاتے ہیں تاکہ ان امراء کے اخراجات کے لیے روپیہ حاصل ہوتا رہے۔ اُدھر یہ امراء اپنی نفس پرستیوں اور شہوت رانیوں پر پانی کی طرح روپیہ بہاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ملک و ملت کے ضروری مصالح پر خرچ کرنے کے لیے ان کے پاس کچھ نہیں بچتا انجام ظاہر ہے کہ تمدن اور انسانیت

ہیں زہریلے اثرات پھیلنے لگتے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ فساد ساری قوم میں سرایت کر جاتا ہے اور وہ سسک سسک کر جان دے دیتی ہے۔ جب دنیاوی زندگی یُوں برباد ہو جائے، تو اُخروی زندگی کی کیفیّت تو ناقابلِ بیان ہی ہوتی ہے +

بقول امام ولی اللہ دہلویؒ یہی وہ مرض تھا، جو حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کے وقت ایرانی اور رومی تمدّنوں میں پیدا ہو چکا تھا۔ لہٰذا حکیمِ مطلق نے اپنے بھیجے ہوئے طبیبِ روحانی (علیہ السّلام) کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ ان قوموں کو اس خطرناک مرض سے نجات دینے کے لیے مرض کا مادہ ہی جڑ سے نکال پھینکے۔ چنانچہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نگاہِ حکمت بیں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ مقامات تلاش کیے، جن کی نسبت گمانِ غالب تھا، کہ یہ اس خطرناک تمدّنی مرض کے جراثیم کی تربیت گاہیں ہیں، جن سے حقیقی صالح انسانیت برباد ہوتی ہے۔ مثلاً گانے والیاں (لڑکیاں، داسیاں)، ریشم کا استعمال، ردّی سونے کے عوض میں اچھا سونا لینا وغیرہ۔ ان سب چیزوں کو ممنوع قرار دے دیا اور اس طرح ایک ایسے تمدّن کی بنیاد رکھی، جو طبعی انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہے۔ اس نکتے کی تفصیل حضرت امامؒ ایک جگہ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں :-

اعلم أن العجم والروم لما توارثوا الخلافة قرونا

كثيرة وخاضوا فى لذة الدنيا ونسوا الدار الآخرة واستحوذ عليهم الشيطان تعمقوا فى مرافق المعيشة وتباهوبها وورد عليهم حكماء الآفاق يستنبطون لهم دقائق المعاش ومرافقه فمازالوا يعملون بها ويزيد بعضهم على بعض ويتباهون بها حتى قيل انهم كانوا يعيرون من كان يلبس من صناديدهم منطقة أوتاجا قيمتها دون مائة الف درهم أولا يكون له قصر شامخ وآبزن وحمام وبساتين ولايكون له دواب فارهة وغلمان حسان ولايكون له توسع فى المطاعم وتجمل فى الملابس وذكر ذلك يطول وما تراه من ملوك بلادك يغنيك عن حكاياتهم

فدخل كل ذلك فى اصول معاشهم وصار لايخرج من قلوبهم الا ان تمزع وتولد من ذلك داء عضال دخل فى جميع اعضاء المدينة وآفة عظيمة لم يبق منهم أحد من اسواقهم ورساقهم وغنيهم وفقيرهم الا قد استولت عليه وأخذت بتلابيبه واعجزته فى نفسه وأهاجت عليه غموما وهموما لا ارجاء لها وذلك ان تلك الاشياء لم تكن لتحصل

الا ببذل اموال خطيرة ولا تحصل تلك الاموال الا بتضعيف الضرائب على الفلاحين والتجار و اشباههم والتضييق عليهم فان امتنعوا قاتلوهم وعذّبوهم وان أطاعوا جعلوهم بمنزلة الحمير والبقر يستعمل فى النضح والدياس والحصاد ولا تقتنى الا ليستعان بها فى الحاجات ثم لا تترك ساعة من العناء حتى صاروا لا يرفعون رؤسهم إلى السعادة الاخروية أصلاً ولا يستطيعون ذلك ربما كان إقليم واسع ليس فيهم أحد يهمه دينه:

ولم يكن ليحصل أيضاً إلا بقوم يتكسبون بتهيئة تلك المطاعم والملابس والابنية و غيرها ويتركون أصول المكاسب التى عليها بناء نظام العالم وصار عامة من يطوف عليهم يتكلفون محاكاة الصناديد فى هذه الاشياء والا لم يجدوا عندهم حظوة ولا كانوا عندهم على بال، وصار جمهور الناس عيالاً على الخليفة يتكففون منه تارة على انهم من الغزاة والمدبّرين للمدينة يترسمون برسومهم

ولا یکون المقصود دفع الحاجة ولکن القیام بسیرة سلفهم، وتارة علی انهم شعراء جرت عادة الملوك بصلتهم، وتارة علی انهم زهاد و فقراء یقبح من الخلیفة أن لا یتفقد حالهم فیضیق بعضهم بعضا و تتوقف مکاسبهم علی صحبة الملوك والرفق بهم و حسن المحاورة معهم والتملق منهم وکان ذلك هو الفن الذی تتعمق أفکارهم فیه وتضیع أوقاتهم معه۔"

(حجۃ اللہ البالغہ، جلد اوّل، صفحہ ۱۰۵-۱۰۶)

یعنی "جب ایرانیوں اور رومیوں کو مختلف اقوام پر حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں اور انہوں نے دنیوی زندگی ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا اور آخرت کو فراموش کر بیٹھے اور شیطنت ان پر غالب آ گئی، تو اُن کی زندگی کا حاصل یہ بن گیا، کہ عیش میں دن گزاریں۔ چنانچہ ان میں ہر ایک شخص دادِ عیش دینے لگ گیا اور اس پر اترانے لگا ان کی یہ طرز زندگی دیکھ کر دنیا کے ہر گوشے سے علماء اور سائنس دان اُن کے گرد جمع ہونے لگ گئے، جو اُن کے لیے سامانِ عیش مہیا کرنے کے لیے عجیب عجیب دقیقہ سنجیاں اور نکتہ آفرینیاں کرنے لگے۔ بلکہ سامانِ عیش کی ایجادات و اختراعات پر ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کی کوشش کرنے لگے اور ان ایجادات کو باعثِ فخر سمجھنے لگے۔ یہاں تک کہ ان سرمایہ پرست امراء کا یہ حال ہو گیا، کہ جس کسی کے پاس

ایک لاکھ درہم سے کم مالیت کا پٹکا یا کلاہ نہ ہوتا تھا، اُسے بخیلی کا عار دلایا جاتا تھا۔

ایسے ہی اُنھوں نے عالیشان، سربفلک محل، اعلیٰ درجے کے آبزن، نفیس حمام، نظر افروز پائیں باغ، سواری کے نمائشی جانور، خدمت کے لیے خوبصورت غلام اور حسین باندیاں اپنی زندگی کا لازم جُز قرار دے لیں اور مقصدِ حیات صرف اسے سمجھ لیا کہ صبح و شام عیش و نشاط کی محفلیں ہوں، جن میں طرح طرح کے کھانے، وسیع دسترخوانوں پر چُنے ہوں، وہ لباسِ فاخرہ پہنے ان پر بیٹھے ہوں۔

غرض ان ملوکِ ایران و روم کی داستان پاستان کہاں تک بیان کی جائے، تم اپنے زمانے کے اُمراء و پادشاہانِ دہلی کی جو حالت دیکھتے ہو، وہی ان ملوک ایران و روم کی حالت کا قیاس کرنے کے لیے کافی ہے۔

ان ملوک و امراء کی زندگی کے طور طریقے رفتہ رفتہ عوام کے نظامِ معاشرت کے اصلِ اصول بن گئے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی، کہ سوسائٹی میں ان خرابیوں کا استیصال ناممکن ہوگیا اور اس کی یہی ایک صورت باقی رہ گئی، کہ ممکن ہو، تو یہ بدعادات ان لوگوں کے دلوں سے کھُرچ کھُرچ کر نکال دی جائیں۔

بادشاہوں اور امیروں کی اس عیاشانہ زندگی سے بہت سے خطرناک معاشی و معاشرتی امراض پیدا ہوگئے، جو حیاتِ معاشرتی (Social Life) کے ہر ایک شعبے میں داخل ہوگئے اور یہ حالت ایسی ہمہ گیر

ہوگئی۔ کہ وبا کی طرح ساری مملکت میں سرایت کرگئی۔ اس سے نہ شہری بچا نہ دہاتی۔ نہ امیر محفوظ رہا، نہ غریب۔ یہاں تک کہ ہر شخص اس کی خرابیاں دیکھتا تھا، مگر علاج سے مایوس تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا، کہ عوام و خواص شدید مالی مصائب میں مبتلا ہو کر رہ گئے۔

اس ہمہ گیر مصیبت کا سبب یہ تھا، کہ یہ سامانِ تعیش کثیر زر و مال صرف کیے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا تھا اور ظاہر ہے کہ مالِ کثیر کاشتکاروں اور تاجروں وغیرہ پر نئے ٹیکس لگانے اور پہلے کے لگے ہوئے ٹیکسوں میں اضافہ کیے بغیر حاصل نہ ہو سکتا تھا پھر مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ گراں بار ٹیکس لوگوں کو طرح طرح سے تنگ کرکے وصول کیے جاتے تھے۔ اگر وہ ٹیکس ادا کرنے سے انکار کرتے تھے، تو اُن کے خلاف فوجی کارروائی کی جاتی تھی اور اُنہیں گرفتار کرکے طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا کیا جاتا۔ اگر وہ اطاعت شعاری کے ساتھ ادا کرتے رہتے، تو ان سے ٹیکس لیتے لیتے اُنہیں گدھوں اور بیلوں کے درجے تک پہنچا دیا جاتا[1]۔ جن سے آبپاشی، فصل کاٹنے اور گاہنے کا کام

---

[1] انسانوں کے ایک بہت بڑے طبقے پر یہی وہ شدید ظلم تھا جسے دور کرنے کے لیے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصرِ روم کو اپنے خط میں چیلنج دیا کہ " انی ادعوک بدعایۃ الاسلام، اَسلِم، تَسلَم، یوتیک اللہ اجرک مرتین فان تولیت فانّ علیک اثم الیریسیین (یعنی میں تم کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر اُسے مان لوگے، تو دنیا میں بھی بچ رہوگے اور اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا دُگنا

(باقی صہ ۱۳۹ پر)

لیا جاتا ہے اور صرف اس لیے زندہ رکھا جاتا ہے کہ ان سے حاجت براری کی جاتی ہے۔

اس اقتصادی بدحالی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ ٹیکس ادا کرنے اور اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے سوا اور کوئی کام کر ہی نہیں سکتے۔ چہ جائیکہ سعادت اُخروی کے متعلق سوچ سکیں۔ رفتہ رفتہ ان میں اس طرح سوچنے اور فکر کرنے کا مادہ ہی فنا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملک بھر میں ایک شخص بھی ایسا نہیں رہتا، کہ مادی اسباب کے حصول سے اُوپر نظر اُٹھا کر غیر مادی کائنات کے اصولِ حیات کے مطابق بھی کوئی حرکت کر سکے۔

اس فاسد معاشی نظام میں سامانِ عیاشی جہاں مالِ خطیر کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے، وہاں ان کے حصول کے لیے یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے، کہ بعض لوگ ان عیاشیوں کے لیے طرح طرح کے کھانے اور عیاشی میں مدد دینے والی دوائیں تیار کرنے اور لباس فاخرہ ایجاد کرنے اور عالیشان محلات تعمیر کرنے کے پیشے اختیار کر لیں۔ ان پیشوں کے وجود میں آنے کی وجہ سے وہ اصلی پیشے جن پر انسانی معاشرے کا نظام مبنی ہے، مہمل رہ جاتے ہیں۔

یہ مصیبت سوسائٹی کے بالائی طبقے ہی میں بند نہیں رہ جاتی، بلکہ رفتہ رفتہ عوام میں بھی سرایت کر جاتی ہے۔ کیونکہ ان کا واسطہ امرا سے پڑتا ہے

(بقیہ صفحہ ۱۳۹) اجر دے گا۔ اگر تم نے اس دعوت کو قبول نہ کیا، تو تمہارے کسانوں پر جو ظلم ہو رہے ہیں اور وہ اپنی جہالت کے باعث جو غلطیاں کر رہے ہیں، ان کے تم ذمہ دار اور جوابدہ ہو گے۔
(مرتب)

اور انہیں اُن امرا کی ریس کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ اُنہیں اپنے آقاؤں کی نگاہوں میں عزت و احترام نصیب نہیں ہوتا اور نہ ان کے درباروں میں قدر ہوتی ہے۔

اس طرح رفتہ رفتہ امیر و غریب سب کا بارِ کفالت پادشاہ پر آ پڑتا ہے اور سب اس سے روزینہ طلب کرتے ہیں۔ مثلاً ایک طبقہ جنگی خدمات سرانجام تو نہیں دیتا، مگر مجاہد باپ دادا کے نام سے وظیفہ خوری کرتا ہے۔ دوسرا طبقہ مدبّرینِ مملکت کے نام سے پرورش پاتا ہے، حالانکہ وہ بھی اس سلسلے میں کوئی واقعی کام نہیں کرتے، صرف اپنے باپ دادا کے نام کو کھاتے ہیں۔ ایک گروہ پادشاہ اور امرا کی قصیدہ خوانی کو پیشہ بنا کر ان کے خوانِ کرم سے زلّہ ربائی کرتا ہے۔ کوئی صوفی اور فقیر بن کر دُعا گوئی کے بہانے استحصالِ زر کرتا ہے۔

ان لوگوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے ایک دوسرے کے لیے معاشی تنگی کا موجب بن جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے، کہ کسبِ معاش کے مفید اصولی ذرائع کے بجائے ان لوگوں کا ذریعہ معاش مصاحبت اور ندیمی، چرب زبانی اور چاپلوسی رہ جاتا ہے اور اب اہلِ فکر کے افکار انہی "فنونِ لطیفہ" میں دقیقہ سنجی کرنے پر وقف ہو جاتے ہیں اور وہ انہی میں اپنے اوقاتِ عزیز ضائع کرنے لگ جاتے ہیں"۔)

جب سوسائٹی کی یہ حالت ہوجاتی ہے، تو ان کی ذہنی کیفیت بھی بدل جاتی ہے اور بلند نظری اور ایثار و قربانی کی جگہ تمام افراد کے نفوس میں ہیأتِ خسیسہ جمع ہو جاتی ہیں اور وہ اُن اخلاق فاضلہ سے عاری ہوجاتے ہیں، جو قوموں کو بلند مقام پر رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ ایسی حالت میں حکمتِ الٰہی اس قوم کو اور اس نظام کو برباد کرنے کے سامان مہیا کرنے لگتی ہے اور انقلاب آکر اُسے ختم کردیتا ہے۔ چنانچہ حضرت امامؒ اسی سلسلے میں آگے چل کر فرماتے ہیں کہ:-

فلما عَظُمت هٰذه المصيبةُ واشتد هذا المرضُ سخط عليهم اللهُ والملائكةُ المقربُون وكان رضاه تعالىٰ فی معالجة هذا المرض بقطع مادتة فبعث نبيا أميّا صلّى اللهُ عليه واٰله وسلم لم يخالط العجم و الروم ولم يترسّم برسومهم وجعله ميزانا يعرف به الهدى الصالح المرضى الله من غير المرضى وانطقه بذمّ عادات الاعاجم وقبح الاستغراق فى الحياة الدنيا والاطمئنان بها ونفث فى قلبه أن يحرّم عليهم رؤس ما اعتاده الاعاجم وتباهوا بها كلبس الحرير والقسى والارجوان والاستعمال أوانى الذهب والفضة وحلى الذهب غير المقطع والثياب المصنوعة فيها الصور وتزويق البيوت وغير ذلك۔ وقضى بزوال دولتهم بدولته و

ریاستھم بریاستہ وبأنہ ھلك کسری فلا کسری بعدہٗ وھلك قیصر فلا قیصر بعدہٗ"۔ (حجۃ اللہ البالغہ، جلد ۱، صفحہ ۱۰۶)

(یعنی "جب یہ مصیبت بہت بڑھ گئی اور مرض نے شدت اختیار کرلی، تو خدا تعالیٰ اور اس کے مقرب فرشتے (یعنی ملاءِ اعلیٰ) ناراض ہوئے۔ اس وقت خدا تعالیٰ کی مشیت یہ ہوئی، کہ اس مرض کا مادہ ہی کاٹ کر پھینک دیا جائے کیونکہ مرض لاعلاج حد تک بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ اس غرض کے لیے خدا تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، جو بالکل اَن پڑھ تھے اور جنھوں نے کبھی ایرانی اور رومی سوسائٹی میں میل جول نہ رکھا تھا اور نہ ان کی رسم و رواج اور طرزِ معاشرت اختیار کی تھی۔ اور آنحضرت صلعم کو رسوم صالح اور غیر صالح کے درمیان تمیز کرنے کا معیار قرار دیا اور ان کی زبانِ فیض ترجمان سے عجمیوں کی رسموں کی مذمت کروائی اور دُنیاوی زندگی میں انہماک اور اس پر اطمینان کر کے بیٹھ جانے کی خرابی ظاہر کی۔ اُن کے دل میں ڈالا، کہ جن اخلاقِ فاسدہ اور رسومِ ردیہ کے عجمی عادی ہیں اور جن پر وہ فخر و مباہات کرتے ہیں، وہ حرام ہیں۔ مثلاً ریشمی لباس، ارغوانی کپڑے، سنہری اور روپہلی برتن سنہری زیور، ایسے کپڑے جن پر تصویریں بنی ہوئی ہوں۔ مکانوں پر نقش و نگار۔ خداوند تعالیٰ نے فیصلہ کیا، کہ اس نبیؐ کی حکومت کے ذریعے سے ان۔ قیصر و کسریٰ — کی حکومت کو برباد کردے اور اُس کی لیڈر شپ — (Leadership) کے ذریعے سے ان کی لیڈر شپ کو ختم کردے۔ چنانچہ اس کے وجود سے کسریٰ ہلاک ہوگیا۔ پھر کوئی کسریٰ نہ ہوگا اور قیصر کی قیصریت

ختم ہو گئی اور پھر کوئی اس کا جانشین نہ ہو سکے گا"۔)

غرض حضرت امام صاحبؒ کے نزدیک حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہر ایک اجتماع انسانی میں سے اقتصادی و معاشی عدمِ توازن جبراً دُور کر کے منصفانہ اور عادلانہ اصولوں پر نیا نظام قائم کرنے کے لیے ہوئی تھی؛ تاکہ لوگوں کو خدا کی طرف رجوع کرنے کی مہلت ملے۔ آپؐ کے زمانے میں یہ عدمِ توازن ایرانی اور رومی ملوکیتوں (Imperialisms) کا پیدا کردہ تھا، اس لیے معاشرۂ انسانی کی اصلاح کے لیے ان کی بربادی آپؐ کی بعثت کا ایک بہت ہی اہم مقصد تھا۔

آج بھی دنیا اسی منزل میں آ چکی ہے۔ اس لیے قرآن حکیم کے ماتحت ایک عالمگیر انقلاب کے حالات پیدا ہو گئے ہیں۔

چھٹا باب

اِرتفاقِ چہارُم

یعنی

ثقافت کی چوتھی منزل : بین الاقوامیت

ضرورت | پچھلے صفحات میں یہ دکھایا جا چکا ہے، کہ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ کے نزدیک ارتفاقِ سوم قومی درجے کی چیز ہے۔ جب مختلف اقوام نے ارتفاقِ سوم کے درجے میں اپنا اپنا نظام مکمل کر لیا۔ اور فوجی نظم ونسق بھی پایۂ تکمیل کو پہنچا لیا، تو اُن کے درمیان اسی طرح حسد اور لڑائی جھگڑے پیدا ہونے لگ گئے، جس طرح انسانی افراد میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے فطرتِ انسانی نے تجربے کی بنا پر تقاضا کیا کہ ایک ایسا بین الاقوامی نظام (International Organisation) پیدا کیا جائے، جو مختلف

خود مختار ریاستوں کے درمیان نظم قائم رکھ سکے ۔

نظام کیسا ہو؟ حضرت امام کے نزدیک اس قسم کا بین الاقوامی نظام فوجی نقطۂ نگاہ سے اتنا مضبوط ہونا چاہیے، کہ چند ریاستیں مل کر بھی اس کا مقابلہ نہ کرسکیں اور وہ ہر ایک سرکش قوم کا سر کچل سکے۔ اس کا اپنا فوجی نظام ہو۔ اور اُسے اپنی قوت کے لیے کسی پر بھروسہ نہ کرنا پڑے۔ اس کے ماتحت بین الاقوامی نظام کے مختلف محکمے فوجی، مالی، ارشاد و وعظ و نصیحت، قضا (Judiciary) پولیس وغیرہ ہوں اور ان پر ایسے آدمی مقرر کیے جائیں، جن کا عدل و انصاف مسلّم ہو۔ یہ نظام اتنا زبردست ہو، کہ اس کے مخالفین اس کے اندر نہ رہ سکیں۔ اگر مخالفین فوجوں کے اندر مرکزی حکومت کے خلاف کسی قسم کا اجتماع پیدا کرلیں، تو اُس کے خلاف دُوسرا اجتماع پیدا کرکے اُن کا زور توڑ دیا جائے۔ اس طرح مختلف جماعتوں کا مرکزی حکومت کے خلاف اتحاد پیدا نہ ہوسکے گا۔ جب کبھی مرکزی حکومت کے خلاف کسی قسم کا اجتماع پیدا ہونے لگے، حکومت کا فرض ہوگا کہ مفسدوں کے سرداروں کو قتل کردے یا اُنہیں قید کردے یا ان کے مال اور اراضی ضبط کرلے یا خود پروپیگنڈہ کرکے رائے عامہ کو ان کے خلاف کردے۔ حضرت امام صاحبؒ کے خاص الفاظ یہ ہیں :-

بإذالة شوكتها او كبت قوم مفسدين فى الارض بقتل رؤسهم المدبّرين لهم او حبسهم او حيازة اموالهم واراضيهم او صرف وجوه الرعيّة

عنہم (حجۃ اللہ البالغہ، جلد ۱، صفحہ ۴۸)

(یعنی "مفسد پارٹی کی شوکت توڑ دی جائے اور جو لوگ ان کے پیچھے تدبیریں کرنے والے ہوں، انہیں قتل کر دیا جائے یا قید کر دیا جائے یا ان کے اموال اور اراضی ضبط کر لی جائیں یا رعایا کے بڑے آدمیوں کی توجہ ان کی طرف سے ہٹا دی جائے"۔

اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت

حضرت امامؒ کے قول کے مطابق اس قسم کے بین الاقوامی نظامِ عدل کا قیام خداوند تعالیٰ کے نزدیک انسانیت پر اس کی نعمت کی تکمیل ہے یعنی خداوند تعالیٰ نے اجتماعِ انسانی کی ترقی کی جو راہ طبعی طور پر مقرر کی ہے، اس کی انتہا یہ ہے، کہ کرۂ زمین پر اس قسم کا ایک مستقل، پائدار بین الاقوامی نظام قائم ہو جائے۔ کیونکہ اس کے ذریعے سے تمام اقوام کے ناقابلِ اصلاح شریر لوگ قابو میں آجاتے ہیں اور انہیں یہ موقع نہیں مل سکتا، کہ ایک ملک میں بیٹھ کر دوسرے ملک کے لوگوں کے خلاف سازشیں کرتے رہیں۔ اس طرح تمام نوعِ انسان کو راحت نصیب ہو جاتی ہے اور مختلف اجتماعات میں وہ ربط و اتحاد پیدا ہو جاتا ہے، جو ان کی دنیاوی فلاح اور مرنے کے بعد کی زندگی کی کامیابی کا کفیل ہے۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب

حضرت امامؒ فرماتے ہیں، کہ اس ارتفاق کے مکمل ہو جانے کے بعد نظامِ عالم مکمل ہو جاتا ہے اور یہی وہ ارتفاق ہے، جس کی تکمیل کے لیے حضرت محمد رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے ہیں۔ اُن کے خاص الفاظ یہ ہیں:-

"ولما کان الشرُّ الساری فی زمنِ ابراھیمَ علیہ السلامُ ھُو نسیانُ التوحیدِ نزل الحقُّ بازائہ باشاعۃِ التوحید وتولید العباداتِ من طہارۃٍ وصلوٰۃٍ وزکوٰۃٍ وحجٍ وصومٍ وذِکرٍ، ولما کان الشر الساری فی زمنِ نبینا محمدٍ صلی اللہ عَلَیہِ وسلم اختلالُ المللِ وانقلابُ الارتفاقاتِ خاصّۃً علیٰ اَصحابھا وکانَ الامرُ اشدُّ واَقسیٰ نزل الحقُّ بازائہ بالجھادِ واشاعۃِ العباداتِ وتوقیتھا والقضاءِ بزوالِ دولۃِ الرومِ والعجمِ وانتظامِ امرِ النبوۃِ کھیئۃِ الارتفاقِ الرابعِ"۔

(التفہیمات الالٰھیہ، جلد اوّل، صفحہ ۶۰)

(یعنی "چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں دنیا توحید کو فراموش کر چکی تھی، اس لیے اس زمانے میں توحید کی اشاعت اور طہارت، صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، روزہ اور ذکر کی عبادتیں جاری کرنے کے احکام نازل ہوئے مگر چونکہ ہمارے نبیِ اکرم، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اقوام کے اندر ثقافتی (معاشی ومعاشرتی) فسادات پیدا ہو چکے تھے اور اُن کی ارتفاقی زندگی خراب ہو چکی تھی اور یہ خرابی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کی خرابی سے زیادہ شدید شکل میں ظاہر ہوئی تھی، اس لیے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان معاشی وارتفاقی خرابیوں کے استیصال کے لیے جہاد اور اشاعتِ عبادات اور ان کے اوقات معین کرنے کا حکم ہوا اور حکمتِ الٰہی نے فیصلہ کیا کہ اس نبیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے رومی اور ایرانی ملوکیتوں کو برباد کر دیا جائے اور

ان کی جگہ نبوی بین الاقوامی حکومت قائم کی جائے"۔

گویا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک معاشی خرابیوں نے جو شدید صورت اختیار کر لی تھی اور انسانی معاشرے (Society) میں جو اقتصادی اونچ نیچ پیدا ہو چکی تھی، اُس سے انسانیت عامّہ کو سخت نقصان پہنچ رہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی مقرر ہونے کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ عبادت کے اوقات معین کریں۔ دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ انسانی سوسائٹی میں عادلانہ معاشی نظام قائم کریں چونکہ اُس زمانے میں اس عدمِ توازن کی بدترین شکل وہ تھی، جو رومی اور ایرانی "شہنشاہتوں" کی شکل میں موجود تھی، اس لیے ان "شہنشاہتوں" کو برباد کرنا آپؐ کے منصب کی کامیابی کے لیے ضمناً اصولی چیز بن گئی تھی۔ اس کی عمومی شکل یہ ہے کہ آپؐ کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ایک ایسا عالمگیر بین الاقوامی نظام پیدا کیا جائے، جو ایک طرف تو خداشناسی کے اصول پر عمل کرے اور دوسری طرف صحیح معاشی اصول پر قائم ہو۔ اس سے ظاہر ہے۔ کہ ہر زمانے میں قرآنی اصول پر قائم ہونے والی جماعت کا نصب العین اسی قسم کے بین الاقوامی نظام کی تعمیر ہے۔ اور یہ جماعت ہر ارتجاع کے بعد اُسی قسم کا انقلابی نظام قائم کرنے کی مکلّف ہے۔

غرض قرآنِ حکیم اپنے عادلانہ نظام کو مجمع اقوام کی شکل میں کامیاب کرنا چاہتا ہے، جس کی شکل یہ ہوگی کہ ہر ایک قوم اس نظام کو اپنے اندر نافذ کر کے ایک بین الاقوامی مرکز کے ساتھ وابستہ ہو جائے گی، جس میں قرآن ہی کا عادلانہ قانون فائق ہوگا۔

ساتواں باب

اُصولِ ارتفاقات

پر

اَقوامِ عالم کا اِتّفاق

حضرت امام الحکمت، امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ:۔

اُصولِ ارتفاقات میں اتحاد | کرۂ زمین کے آباد علاقوں میں کوئی شہر ایسا نہیں ہے، جس میں یہ ارتفاقات نہ پائے جاتے ہوں اور آغازِ انسانیت سے اب تک معتدل مزاج اور اچھے اخلاق والی جتنی قومیں گزری ہیں، اُن سب میں یہ ارتفاقات پائے جاتے رہے ہیں اور انسانیت کے خاتمے تک پائے جاتے رہیں گے۔ گو اِن ارتفاقات کی شکلیں مختلف ہوں۔ لیکن ان کے اصول ہر زمانے اور ہر ایک اجتماعِ انسانی میں مسلّم رہے ہیں اور ان اُصول کو اتنی مقبولیت عامہ حاصل ہو چکی ہے کہ جو انہیں نہ مانیں، لوگ ان کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں۔ مثلاً مُردے کی لاش کا انتظام کرنا گویا

کا چھپانا، نکاح کی تشہیر کرنا، زانیوں اور چوروں کو سزا دینا وغیرہ، یہ سب تمام اجتماعات میں مسلّم ہیں، گو انہیں عمل میں لانے کی شکلیں مختلف ہیں +

اصولِ ارتفاقات فطری ہیں | لوگوں کے مزاجوں کے اختلاف، ان کے شہروں کے دُور دُور ہونے اور اُن کا مذہب ایک نہ ہونے کے باوجود ان میں بعض اُصول پر اتفاق ہے تو یہ اتفاقی امر نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ نتیجہ ہے اُس فطرتِ انسانی کا جو اس کی صورتِ نوعیہ کا تقاضا ہے۔ چنانچہ جب انسانی افراد کو حاجتیں پیش آتی ہیں، تو سب افراد انہیں کم و بیش ایک ہی طرح پوری کرتے ہیں اور جب انہیں اپنی صحیح فطرت کے مطابق جانچتے ہیں، تو ایک ہی قسم کے انسانی خُلق کے مطابق دیکھتے ہیں +

یہ اُصول طبعی ہیں | حضرت امامؒ کے نزدیک ارتفاقات کی یہ چاروں منزلیں انسان کے لیے ویسی ہی طبعی ہیں، جیسے سانس لینا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ فرض کرو کہ ایک آدمی انسانی آبادی سے دُور جنگل میں رہتا ہے۔ نہ اُس نے کسی سے زبان سیکھی ہے، نہ کوئی اور بات۔ وہ سب سے پہلے تو اپنی بھوک پیاس کا علاج سوچے گا۔ پھر جوان ہوگا، تو اُسے طبعی طور پر اپنے لیے ایک جوڑے (Mate) کی خواہش ہوگی۔ اب فرض کیجیے کہ اُسی جنگل کے کسی دوسرے حصّے میں ایک عورت انہی حالات میں زندگی گزار رہی ہے۔ وہ بھی انہی حالات سے گزر کر جوانی کو پہنچتی ہے، تو اُسے بھی طبعی طور پر جوڑے کی تلاش ہوگی۔ فرض کیجیے کہ کسی دن اتفاق سے یہ دونوں آپس میں مل جاتے ہیں۔ اب اُن سے اولاد پیدا ہونی شروع

ہو گی۔ ایک طویل زمانے میں جو نسل اس جنگل میں بڑھے گی، وہ کسی انسان کی خارجی امداد کے بغیر خود ہی ارتفاقات کے چاروں درجے طے کر لے گی۔ اس آبادی میں بعض عقلمند بھی پیدا ہوں گے، جو معرفتِ الٰہی حاصل کریں گے اور محسوس کریں گے، کہ ارتفاقاتِ معاشیہ یعنی آلات اور اجتماعات سے کام لے کر تھوڑی محنت، قلیل مواد اور کم وقت صرف کر کے زیادہ نتیجہ حاصل کر لینے کا فائدہ یہی ہے، کہ انسان اپنا کچھ وقت عقلی تفکّر، یعنی معرفتِ الٰہی کے لیے نکالے اور کچھ وقت خدمتِ الٰہی میں صرف کرے، جس کی شکل یہ ہے کہ خدا کی کمزور مخلوق کی خدمت کرے۔ حضرت امامؒ صاحب کے خاص الفاظ یہ ہیں:۔

ولو ان انسانًا نشأ ببادیۃٍ نائیۃٍ عن البلدانِ ولم یتعلمْ مِن احدٍ رسمًا کان له لاجرمَ حاجاتٌ من الجوع و العطش والغلمۃ واشتاق لا محالۃ الی امرأۃٍ و لابد عند صحۃ مزاجھما ان یتولّدَ بینھما اولادٌ وینضم اھل ابیاتٍ وینشأُ فیھم معاملاتٌ فینتظم الارتفاق الاوّل عن آخرہ ثم اذا کثروا لابدّ ان یکون فیھم اھل اخلاق فاضلۃٍ تقع فیھم وقائع توجب سائر الارتفاقات'' (حجۃ اللہ البالغہ، جلدِ اوّل، صفحہ ۴۹)

(یعنی ''فرض کرو کہ کوئی انسان شہروں سے دُور کسی جنگل بیابان میں رہتا ہے۔ اُس نے کسی سے کوئی ارتفاق نہیں سیکھا۔ اس کے باوجود

اُسے بھوک پیاس اور جنسی خواہش محسوس ہوگی۔ وہ ان خواہشوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا اور عورت کی بھی ضرورت محسوس کرے گا۔ اگر مرد اور عورت کی صحت مزاجی درست ہے، تو ضرور اُن سے اولاد بھی پیدا ہوگی، جو بڑھتے بڑھتے بہت سے خاندانوں میں بٹ جائے گی۔ یہ سب اہل خاندان آپس میں میل جول رکھیں گے اور لین دین کریں گے۔ اس طرح ارتفاقِ اوّل آخر تک مکمل کر لیں گے۔

پھر ان کی آبادی اور بڑھے گی، تو ضرور ان میں حکما پیدا ہوں گے۔ جب اس کثیر آبادی کے درمیان معاملات ہوں گے، تو رفتہ رفتہ سب ارتفاقی منازل طے ہوں گی"۔

"بدور بازغہ" میں فرماتے ہیں کہ کُرۂ زمین کا کوئی خطہ جہاں انسانی آبادی ہے، ارتفاقِ اوّل سے خالی نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہی اس میں ارتفاق دوم کا وسطانی درجہ بھی ضرور پایا جائے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ارتفاقات کا تیسرا درجہ بھی ظاہر کرتا ہے۔ جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ یا تو خداوند تعالیٰ سے الہام پانے والا کوئی شخص حکومت پیدا کر لیتا ہے، جو ارتفاقِ سوم کے درجے پر کام کرتی ہے یا پھر خدا کے اس نائب کا نائب انہی اصول پر حکومت چلاتا ہے یا کوئی بادشاہ پیدا ہو جاتا ہے، جو عدالت سے کام لیتا ہے اور اس کے ارد گرد علماء، حکماء اور اہل تجربہ جمع ہو جاتے ہیں، جن کی بدولت نظم و نسق نہایت اعلیٰ پیمانے

پر چلتا ہے۔ یا کوئی ایسا شخص غلبہ حاصل کرلیتا ہے، جو ظلم پسند ہوجاتا ہے، وہ اپنی طرز کے ظالم بادشاہوں کی رسوم اختیار کرلیتا ہے۔ یہ سب قسم کے حاکمِ وقت وقت کے حالات کے مطابق ظاہر ہوتے رہتے ہیں جب آخرالذکر قسم کے لوگ برسرِاقتدار آجاتے ہیں، تو ارتفاقات خراب ہوجاتے ہیں اور ملک میں انسانیت ختم ہوجاتی ہے اور وحشت و بربریت کا دَور دَورہ ہوجاتا ہے۔ اگر اجتماعِ انسانی میں یہ حالت پیدا ہوجائے، تو اُسے مرض سمجھنا چاہیے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ بُحران (Crisis) پیدا کر دیتا ہے، جس سے اس مرض کا ازالہ ہوجاتا ہے، یا وہ اجتماع برباد ہوکر فنا ہوجاتا ہے[1]۔

انبیاء اور حکماء کا کام غرض ہر ایک اجتماعِ انسانی میں نبیوں اور حکیموں کی بدولت ارتفاقات میں ترقی ہوتی رہتی ہے۔ جب تک کوئی قوم دونوں قسم کے ارتفاقات یعنی ارتفاقاتِ معاشیہ اور ارتفاقاتِ الٰہیہ میں ترقی نہ کرے، اُس کا یہ کہنا کہ وہ فلاں بڑے نبی کی اُمت سے ہے یا فلاں بڑے حکیم کے پیرو ہیں بالکل بے فائدہ ہے۔

---

[1] بدورِ بازغہ، صفحہ ۹۵

آٹھواں باب

انسان کی ثقافتی زندگی میں رسموں کا مقام

حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی تصنیفات میں اس امر پر سیر حاصل بحث کی ہے، کہ انسان کی ثقافتی اور تمدنی زندگی میں رسموں کا کیا مقام ہے ان کے نزدیک ارتفاقاتِ صالحہ اُسی وقت اجتماعِ انسانی میں راسخ ہوتے ہیں، جب وہ رسم (Custom) کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر یہ ارتفاقات رسموں کی شکل میں اُن میں راسخ نہ ہوں، تو انسانی افراد بالکل حیوانوں کی سی زندگی بسر کرنے لگیں۔

رسوم کی حقیقت | رسم کیا ہے؟ کسی انسان کا وہ فعل، جس کی حکمت وہ نہیں سمجھتا۔ اس تعریف کے لحاظ سے حیوانات بھی رسم سے خالی نہیں ہیں۔ چنانچہ اگر ایک کبوتر ایک فعل کرتا ہے، تو دوسرا بھی اُسے دیکھ کر وہی حرکت کرنے لگ جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہوتا ہے، کہ ایک کبوتر کے ذہن، پر دوسرے کبوتر کی حرکت مرتسم ہو جاتی اور وہی اُسے اس

حرکت کے کرنے کا شوق دلاتی ہے۔ یہی حالت انسانی ذہن کی ہے۔ مثلاً سب انسان نکاح کر کے گھر بساتے ہیں۔ لیکن اگر کسی سے پوچھو کہ وہ نکاح کی ان حدود و اُصول کی کیوں پابندی کرتا ہے ؟ تو وہ اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکے گا کہ اُس نے اپنے آباواجداد کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔ رسم کی پابندی اقوام میں اس حد تک رائج ہو جاتی ہے، کہ جو لوگ ان رسموں کو چھوڑ دیں، اُنہیں عیب لگایا جاتا ہے۔ ایسے لوگ اگر واقعی رسموں کی پابندی نہ کریں، تو ارتفاقِ اوّل سے بھی نیچے گر جائیں اور حیوانی زندگی بسر کرنے لگیں +

رسوم کی پیدائش امام الائمہ امام ولی اللہ کے نزدیک رسمیں عموماً دو طرح پیدا ہوتی ہیں :-

(۱) کبھی کسی ایسے شخص کو، جس کا تعلق ملاء اعلیٰ یا حظیرۃ القدس کے ساتھ ہوتا ہے، ایسے علوم تفویض (Inspire) ہوتے ہیں، جو انسان کے لیے مفید ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ علوم رسموں کی شکل میں منضبط ہو جاتے ہیں، جیسے نماز پڑھنا +

(۲) کبھی قوم کا کوئی فاضل حکیم تجربے اور سوچ بچار سے، کہ یہ بھی ایک قسم کے الہام کا نتیجہ ہوتی ہے، ایک بات مفید پاتا ہے اور اُسے اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے اردگرد کے لوگ اسے دیکھ کر اُس کی تقلید کرتے ہیں۔ اس میں بھی ملاء سافل کے ملائکہ کا دخل ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ عوام تک اس کا اثر پہنچ جاتا ہے، جیسے مچھلی

کے ساتھ دُودھ نہ پینا کہ یہ برص کا موجب ہو سکتا ہے۔

ان کے پھیلنے کے اسباب | ایسے ہی رسموں کے پھیلنے کے متعدد اسباب ہوتے ہیں۔ مثلاً:-

(۱) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بڑا آدمی ایک رسم اختیار کر لیتا ہے، تو دوسرے درجے کے لوگ اس کی ریس کرنے لگ جاتے ہیں۔ اس طرح وہ رسم عوام میں شائع ہو جاتی ہے۔

(۲) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لوگ ایک چیز کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ مگر وہ احساس اتنا صاف اور واضح نہیں ہوتا، کہ کوئی شکل اختیار کر سکے۔ پھر جب کوئی زیادہ عقلمند آدمی اس مشکل کا حل وضع و اختراع کر لیتا ہے، تو لوگ جھٹ اسے اختیار کر لیتے ہیں۔

(۳) کبھی ایسا ہوتا ہے، کہ لوگ ایک رسم کے پابند ہوتے ہیں۔ پھر اُسے چھوڑ دیتے ہیں، تو وہ کسی عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں یا اس رسم کے ادا کرنے میں سستی کریں، تو کوئی معاشرتی فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس رسم کو پھر اختیار کر لیا جاتا ہے۔

خرابی کے اسباب | حقیقت یہ ہے کہ رسوم اصل میں تو درست ہی ہوتی ہیں، لیکن مرورِ زمانہ سے ان کی حقیقت نظروں سے پوشیدہ ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ ان پر اوہام و شبہات کی تہیں چڑھ جاتی ہیں اور اُن کی اصلی صورت مسخ ہو جاتی ہے۔ اس طرح رسمیں خراب ہو جاتی ہیں۔ اس کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں۔ مثلاً:-

(۱) کبھی ایسے لوگ برسرِ اقتدار آجاتے ہیں، جو مصالحِ کلیّہ کی پیروی نہیں کرتے، بلکہ اپنے محدود ذاتی فائدے کی خاطر اپنے اقتدار کو قائم رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ صحیح اور صالح رسموں کو خراب کردیتے ہیں۔ مثلاً خیرات وصدقہ جمع کرنے والے لوگ پہلے تو اُسے رفاہِ عامّہ کے کاموں میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان اوقاف و ذرائع آمدنی پر خود غرض، نفس پرست لوگ قبضہ کرکے اُنہیں ناجائز موقعوں پر خرچ کرنے لگ جاتے ہیں، تو رفتہ رفتہ صدقہ و خیرات کا رواج کم ہوجاتا ہے +

(۲) کبھی نفس پرست لوگ غلبہ حاصل کرلیتے ہیں، تو اجتماع میں غلط طریقے رائج ہو جاتے ہیں، جیسے صدومیت (Sodomy) زنخاپن یا سود خوری اور کم وزن و پیمائش کی عادت +

(۳) کبھی رفاہیتِ بالغہ (تکلّفات) والے لوگوں کی ریس سے مُسرفانہ رسمیں جاری ہو جاتی ہیں، جیسے شادی بیاہ کے موقعے پر فضول خرچی کرنا، لباس کے معاملے میں تکلّف برتنا، تفریح کے لیے ایسے شوق بڑھالینا جن کے سبب سے دنیاوی زندگی کے کام اور اُخروی زندگی کے اصول معطّل ہو جائیں۔ جیسے مزامیر، شطرنج بازی، کبوتربازی، شکار وغیرہ +

(۴) کبھی ظالم لوگ برسرِاقتدار آجاتے ہیں، وہ ناقابل برداشت ٹیکس لگا دیتے ہیں۔ اس سے سوسائٹی میں حرص و بغض بڑھ جاتا ہے۔ ایسے لوگ خود تو ظلم کرنا پسند کرتے ہیں، مگر یہ پسند نہیں کرتے کہ

خود اُن سے یہی سلوک کیا جائے۔ رفتہ رفتہ لوگ ظلم برداشت کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور یہ ظالمانہ عادتیں عوام میں بھی پھیل جاتی ہیں۔

(۵) رسمیں کبھی اس لیے خراب ہو جاتی ہیں کہ لوگ معاش کے معاملات میں اس قدر انہماک اور تعمق میں مبتلا ہو جاتے ہیں، کہ تقرب الی اللہ کے انہماک کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

بہترین رسمیں وہ ہوتی ہیں، جو اخلاقِ فاضلہ اور بہترین ارتفاقات کی حامل ہوں۔ ان میں عمل کی وسعت پائی جائے نہ کہ تنگی۔ اور ایک طرف تو انتہائی تکلّف سے اور دوسری طرف وحشت سے پاک ہوں۔ جیسے دورِ جاہلیت میں حجاز کے شہریوں کی رسمیں، اور ہمارے زمانے کے قصبوں میں رہنے والوں کی رسمیں۔

انقلاب کی ضرورت | حضرت امامؒ کے نزدیک رسموں کی اس قسم کی انتہائی خرابی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے اور جو لوگ مصلحتِ کلّیہ کو جاننے والے ہوں، ان کا فرض قرار دیتے ہیں کہ وہ انقلاب پیدا کریں۔ حضرت امامؒ کے خاص الفاظ یہ ہیں:۔

"ویجب بذلُ الجُهدِ علی اهلِ الآراء الکلّیة فی اشاعةِ الحقِّ وتمشیتهٖ واخمالِ الباطلِ وصدّهٖ فربما لم یمکن ذٰلك الّا بمخاصماتٍ أو مقاتلاتٍ فیُعد کل ذٰلك من افضل الاعمال البرّ۔"

(حجۃ اللہ البالغہ، جلدِ اوّل، صفحہ ۵۰)

(یعنی "جو لوگ مصلحتِ کلیّہ پہچاننے والے ہوں، اُن کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ حق کی اشاعت اور اُس کے اجراء اور باطل کی بربادی اور اس کے انسداد میں رجان و مال کی پروا کیے بغیر، پوری پوری کوشش کریں۔ اس سلسلے میں اُنہیں پروپیگنڈا بھی کرنا پڑے گا اور مسلح جدوجہد بھی یہ سب کچھ انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے بہترین نیکی شمار ہوتی ہے")۔

انبیاء اور ارتفاقات | ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ ارتفاقِ دوم (شائستگی کا قبائلی درجہ) اور ارتفاقِ سوم (شائستگی کا شہری اور قومی درجہ) انسان کے لیے جبلّی اور طبعی چیزیں ہیں اور انہی کی بدولت وہ تمام حیوانات سے ممتاز ہے۔ ان دونوں درجوں سے انسانی اجتماع کا خالی ہونا محال ہے۔ ان دونوں کی ترقی کے لیے معاشرۂ انسانی کو ایسے حکیم کی ضرورت ہے، جو اجتماعی حاجات کو جانتا ہو اور اُسے اُن حاجات کو ارتفاقات کے ذریعے پورا کرنے کے طریقے کا علم ہو اور وہ مصلحتِ کلّیہ کے تابع ہو کر کام کرے۔ اس حکیم کا طریقِ کار یا تو خود اس کے فکر و تجربہ کا نتیجہ ہوگا یا اُس میں قوتِ ملکیہ ہوگی، جس کے سبب سے وہ ملاءِ اعلیٰ سے براہِ راست علوم اخذ کر سکتا ہوگا (اور یہ آخر الذکر دونوں میں سے زیادہ کامل اور قابلِ اعتماد طریقِ عمل ہے)۔

ہم یہ بھی بیان کر آئے ہیں کہ ارتفاقات کے لیے رسوم بمنزلہ دل کے ہیں اور یہ کہ جب سوسائٹی میں ایسے لوگ برسرِ اقتدار آجاتے ہیں، جو مصلحتِ کلّی (Public Weal) کا خیال رکھنے کے بجائے خودغرضی میں مبتلا ہوں اور اس وجہ سے وہ حیوانی، شہوانی اور شیطانی کام کرنے لگیں

اور اکثر لوگ ان کی پیروی کرنے لگ جاتے ہیں۔ اس وقت رسمیں خراب ہو جاتی ہیں۔ اس وقت ایک ایسے شخص کی ضرورت ہوتی ہے، جسے غیب سے مدد ملتی ہے اور وہ مصلحتِ کلیہ (Public Weal) کے اصول کے مطابق رسموں کو جانچتا ہے۔ اچھی رسموں کو قائم رکھتا ہے۔ جن میں خرابی ہو، ان میں ترمیم کر دیتا ہے اور جو بالکل خراب ہوں انہیں منسوخ کر دیتا ہے۔

یہ جان لینے کے بعد یہ سمجھنا آسان ہے کہ اگرچہ انبیاء آتے تو اس لیے ہیں، کہ سوسائٹی کی علمی خرابیوں کو دور کر کے لوگوں کو خدا کی عبادت کی دعوت دیں۔ لیکن وہ ارتفاقی اصلاح بھی ضرور کرتے ہیں۔

حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی معاشرۂ انسانی ارتفاقِ دوم اور ارتفاقِ سوم (یعنی قبائلی زندگی اور قومی زندگی) کو ترک نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نبی نے کبھی اس کا حکم نہیں دیا۔ اس لیے معاشرۂ انسانی سے بھاگ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا بسنا اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دینا مفادِ انسانی کے قطعاً منافی ہے۔ چنانچہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقِ عمل کی سخت مذمت فرمائی ہے اور صاف صاف فرما دیا ہے کہ "ما بعثت بالرھبانیۃ وانما بعثت بالملۃ الحنیفیۃ السمحۃ" (یعنی "میں رہبانیت کے اصول کو جاری کرنے کے لیے انقلاب لانے پر مبعوث نہیں ہوا ہوں، بلکہ اس لیے انقلاب برپا کر رہا ہوں کہ حنیفیت کے واضح اور روشن اصول دنیا میں رائج ہو جائیں)

اُور حنیفیت کے متعلق حضرت امام الحکمت، امام ولی اللہ کا فیصلہ ہے کہ یہ انسانیت عامّہ کی ترجمان ہے[۱]۔

لیکن یہاں ایک امر کی وضاحت کی ضرورت ہے اُور وہ یہ کہ اگرچہ تمام انبیاء اُور حکماء انسان کی ارتفاقی ترقی و اصلاح میں کوشاں رہے ہیں، لیکن اُن کی دعوت اعتدال کی رہی ہے۔ یعنی معاشرہ انسانی نہ تو ارتفاقات میں اتنا انہماک دکھائے کہ عجمی اور رومی امراء کی طرح تکلّفات میں مبتلا ہو جائے اور نہ ارتفاقی زندگی میں اتنی کمی رکھی جائے کہ انسان وحشیانہ زندگی بسر کرنے لگے۔

اعتدال کی ضرورت | اس میں شک نہیں کہ انسان کے لیے ارتفاقات میں ترقی کرنا طبعی چیز ہے اور وہ جب کوئی چیز استعمال کرتا ہے، تو اُسے اچھی سے اچھّی شکل میں استعمال کرنا چاہتا ہے، اس سے اُس کے مزاج میں صحت پیدا ہوتی ہے۔ اخلاق میں استقامت آتی ہے اور انسان کے اندر معنوی ترقّی کا جو جوہر پوشیدہ ہے اُور جس سے ایک انسان دُوسرے سے امتیاز حاصل کرتا ہے، بر رُوئے کار آتا ہے۔ ارتفاقات کو اچھّی شکل میں نہ لانے سے کُند ذہنی، عجز اُور بے تدبیری پیدا ہوتی ہے۔ دُوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ ارتفاقی تکلّفات سے سوسائٹی میں ایسی اُونچ نیچ پیدا ہو جاتی ہے، جو آپس کے جھگڑوں کا سبب بنتی ہے اور جس کی وجہ سے انسان ارتفاقات الٰہیہ اور اُخروی سعادت

---

[۱] تفہیماتِ الٰہیہ، جلد دوم صفحہ ۱۹۸۔

سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس اشکال کا حل یہ ہے، کہ ارتفاقاتِ معاشیہ میں اعتدال قائم رکھا جائے۔ ارتفاقات کو تکلّف کے بغیر حاصل کیا جائے اور اُن میں اللہ کی یاد شامل کی جائے اور عالمِ اخروی کی طرف سے توجہ نہ ہٹائی جائے۔ اسی اُصول کے مطابق حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ریشم کا لباس اور چاندی سونے کے برتنوں کا استعمال ممنوع قرار دے دیا اور ایک جنس کو اسی جنس سے بدلنا حرام قرار دے دیا۔ کیونکہ اس سے مطلوب عموماً ادنیٰ جنس کے بدلے اعلیٰ جنس حاصل کرنا ہوتا ہے، جو دنیاوی لذات حاصل کرنے کی تیز خواہش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ انسان کی مرنے کے بعد کی زندگی کے لیے مضر ہوتی ہے+

نواں باب

اِرتفاقات میں تنزّل

یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ ارتفاقات کے ان چاروں درجوں کا بیج قدرتِ الٰہی نے انسان کی فطرت کے اندر رکھ دیا ہے۔ اس لیے یہ انسان کے لیے طبعی ہیں۔ اس کے باوجود جس طرح انسان کے بدن پر صحت کے بعد بیماری اور موت کی حالتیں طاری ہوتی ہیں۔ اسی طرح مختلف اجتماعاتِ انسانی پر بھی بیماری اور موت کی حالتیں طاری ہوتی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جب کسی اجتماعِ انسانی پر بیماری کی حالت طاری ہو جائے، جس کے اسباب پر ہم پچھلی فصل میں روشنی ڈال چکے ہیں، تو اس وقت کیا کیا جائے +

تنزّل کے وقت کیا کیا جائے؟ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ جب کوئی قوم ارتفاقِ چہارم کے بلند درجے پر پہنچ کر گر جائے، یعنی جب اس کا بین الاقوامی نظام ٹوٹ جائے، تو اس کے عقلمند طبقے کا فرض ہے کہ وہ اس درجہ کی رُوح یعنی عدل کو اپنے اندر محفوظ کر کے درجۂ سوم پر مضبوطی سے قائم رہے۔

یعنی اپنی قومیت کو نہ بھولے۔ اگر یوں نہیں کرے گی، تو ایسا فتنۂ عظیم اور ایسی خوفناک جنگ پیدا ہو گی، کہ اُس کا وہم و گمان بھی نہ ہو گا +

ایسے ہی اگر کوئی قوم ارتفاقِ سوم سے بھی گر جائے، یعنی اُس کی قومیت کو صدمہ پہنچ جائے، تو اُس کی رُوح یعنی احساسِ قومیت کو قائم رکھتے ہُوئے اور بین الاقوامیت کا تصور قائم رکھتے ہوئے، اچھی قبائلی زندگی یعنی ارتفاقِ دُوم کو قائم رکھے۔ اگر ارتفاقِ دُوم کی زندگی میں بھی کسی سبب سے انتشار پیدا ہو جائے، تو ارتفاقِ اوّل یعنی مہذب انسانیت کو اپنا وطیرہ بنائے رکھے اور ساتھ ہی قبائلیت، قومیت اور بین الاقوامیت کے تصورات کو فراموش نہ کرے +

ایسی گراوٹ کے وقت مصیبت یہ ہوتی ہے، کہ لوگ ارتفاقات کی مختلف منزلوں کا علم کھو بیٹھتے ہیں اور صرف ایک ہی ارتفاق کے علم پر جمود اختیار کر لیتے ہیں۔ اس صورت میں وہ ترقی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ حضرت امامؒ کے خاص الفاظ یہ ہیں :-

وبالجملة فاذا بطل نظام الارتفاق الرّابع مثلاً فصلاح الناس ان يتشبّثوا بالارتفاق الثالث بآدابه المتضمنة لكنه الارتفاق الرابع واصله من غير تمثل وانحسار وانفاذ صورة له كالاصطلاح على سنة عادلة بينهم لو عصوها لثارت الفتنة واقتتلوا وكان البأس عليهم اشدّ عما توقعوا الانفسهم وكذلك اذا

بطل الارتفاق الثالث وجب التمسك بالارتفاق الثانی المتضمن غایةً لکنه الارتفاق الثالث واذا بطل الارتفاق الثانی وجب التمسك بالارتفاق الاوّل واصل الفساد عدم احاطة الناس بانواع الارتفاقات و الجمود علی علمٍ واحدٍ منھا۔" (بدور بازغہ، صفحہ ۸۹-۹۰)

(یعنی "جب کسی اجتماعِ انسانی کا بین الاقوامی نظام ٹوٹ جائے، تو لوگوں کی بھلائی اس میں ہوتی ہے کہ ارتفاقِ چہارم، یعنی بین الاقوامی نظام کی روح قائم رکھتے ہوئے اور اس ارتفاق کی عادلانہ باتوں پر پوری طرح قبضہ رکھتے ہوئے ارتفاقِ سوم کو مضبوطی سے تھامے رہیں۔ اگر وہ ارتفاقِ سوم کے اُصول کو بھی ترک کر دیں گے، تو ان قوموں کے مابین ایسے فتنے اور جنگیں پیدا ہوں گی کہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں گی۔ ایسے ہی اگر ارتفاقِ سوم برباد ہو جائے، تو اس ارتفاق کی حقیقت کا تصور قائم رکھتے ہوئے ارتفاقِ دوم کو مضبوط پکڑے رہیں اور اگر ارتفاقِ دُوم بھی بگڑ جائے، تو اسی طرح ارتفاقِ اوّل کو مضبوط پکڑے رہیں۔ فساد کی جڑ یہ ہے کہ لوگ ارتفاقات کے تمام درجوں کا علم بھول جاتے ہیں اور فقط ایک ہی درجے کے علم پر جمود اختیار کر لیتے ہیں")۔ +

دسواں باب

معاشیات کا اثر اجتماعی اخلاق پر

حکماء اور انفرادیت پسندی: یونانی حکماء حکماء عموماً اخلاقیات (Ethics) اور اجتماعیات (Sociology) پر بحث کرتے ہیں، لیکن انہیں الگ الگ موضوع (Subject) بنا کر۔ چنانچہ یونانی حکماء میں سے ارسطو (Aristotle) افلاطون (Plato) سقراط (Socrates) اپی کیور (Epicurus) وغیرہ نے ان دونوں موضوع پر لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ لیکن ان کے باہمی ربط پر کسی نے قلم نہیں اُٹھایا +

مُسلِم حکماء حکماء اسلام میں سے ابنِ مسکویہ، غزالی، ماوردی، راغب، کِندی، فارابی، ابنِ سینا، ابنِ رشد، ابنِ خلدون، ابنِ عربی وغیرہ نے انفرادی اخلاقیات پر طویل بحثیں کی ہیں۔ ہر ایک خُلق کی بال کی کھال اُتاری ہے۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی اجتماعی اخلاق اور معاشیات کو ملا کر بحث نہیں کی +

مغربی حکماء ایسے ہی کانٹ (Kant) سپنسر (Spencer) شوپن ہار

(Schupenhaur) ڈی کارٹ (Descartes) مل (Mill) سپینوزا (Spinoza) اور ہیگل (Hegel) نے اجتماعیات و اخلاقیات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ان کے باہمی ربط پر کسی نے روشنی نہیں ڈالی +

امام ولی اللہ اور اجتماعیت امام الحکمۃ، امام ولی اللہ دہلویؒ پہلے حکیم ہیں، جنہوں نے اخلاقِ عامہ اور معاشیات و اجتماعیات کے باہمی ربط پر روشنی ڈالی ہے +

اب تک حکماء یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، کہ بلند اخلاقی نظریات سے اجتماعی اخلاق بلند ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ اجتماعیات کو اخلاقیات کے ماتحت رکھا جائے۔ اس کے برخلاف حضرت امام الحکمت، امام ولی اللہ کا نظریہ یہ ہے کہ اجتماعی معاشیات کا اجتماعی اخلاق پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس لیے اجتماعی اخلاق کی درستی کے لیے ضروری ہے کہ اجتماعِ انسانی میں عادلانہ نظامِ معاشیات قائم کیا جائے۔ جب تک اس قسم کا نظام سوسائٹی میں قائم نہ ہو جائے، اجتماعی اخلاق کا حسن نمایاں نہیں ہو سکتا +

فرد اور جماعت پرانے اور نئے سب حکماء اتنی بات تو مانتے ہیں، کہ انفرادی اخلاق کا ظہور اجتماعِ انسانی کے اندر ہی ہوتا ہے۔ یعنی ایک فردِ انسانی کو جب تک کسی سوسائٹی کے رکن کی حیثیت سے نہ دیکھا جائے، اُس کی اخلاقی بلندی نظر نہیں آتی۔ ایک شخص جو جنگل میں رہتا ہے، اپنے کسی خُلق کے اظہار کا موقع نہیں پاتا۔ اس لیے اسے نیک و بد کہنا اپنے اندر کچھ زیادہ معنی نہیں رکھتا۔ لیکن جونہی وہ

اجتماع میں داخل ہو جاتا ہے، اس کے کاموں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اگر اس کے کاموں سے اجتماع کے کسی حصّے کو نفع پہنچتا ہے، تو کہا جائے گا، کہ وہ شخص نیک ہے اور اگر نقصان پہنچتا ہے۔ تو کہا جائے گا کہ وہ بُرا ہے۔ اس "نیکی" اور "بدی" کی مقدار بھی اس بات پر موقوف ہے، کہ اس کے کام کا اثر اجتماع کے تھوڑے حصّے پر پڑتا ہے یا زیادہ حصّے پر۔ جتنا زیادہ حصّہ اس کے کسی فعل سے اثر لے گا، اتنا ہی اس کی "نیکی" یا "بدی" کی مقدار زیادہ یا کم شمار ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ فرد کی اپنی ہستی بھی خاص اہمیت رکھتی ہے، لیکن وہ اجتماع کی تکمیل کے لیے ہے، نہ کہ اس سے الگ رہ کر زندگی بسر کرنے کے لیے۔ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ اجتماع ہی کو "فرد" مانتے ہیں اور انسانی فرد کو اس کا ایک حصّہ یا جُزو قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اُن کا نظریۂ امام نوعِ انسانی یہی فکر ظاہر کرتا ہے۔ وہ اجتماع کی صحت اسے قرار دیتے ہیں کہ افراد کی افراط و تفریط ایک نقطۂ اعتدال پیدا کرلے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:۔

"وافراد الانسان کالاعضا للعنایة الازلیة الرحمانیة المنعقدة فی صورة نوع الانسان فاذا اصلحت الاعضاء کلھا بالفرض، فھو الصحة التامة والاعتدال الحقیقی وھو کالممتنع کما انّ

صحة زید مثلاً بحیث لایکون فی اخلاطه و فی اعضائه افراط و تفریط اصلا کالممتنعة فکذلك انحصر الکلام فی الهیئة القریبة من هذ الصحة وهی انجبار الافراط بالتفریط حتی یعودا لکل بالهیئة الاجتماعیة صالحا،

(البدور البازغه، صفحه ۴۸، ۴۹)

(یعنی "عنایتِ رحمانی (نوع انسانی کے لیے اجمالی تدبیر) انسانی نوع کی صورت میں آکر جمی، تو تمام انسانی افراد اس کے لیے اعضاء کی مانند بن گئے۔ فرض کرو کہ تمام اعضاء اور اجزاء صحت مند ہیں، تو کہا جائے گا کہ یہ کامل صحت اور حقیقی اعتدال ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی کامل صحت اور حقیقی اعتدال قطعاً ناممکن ہے اس کی مثال یوں سمجھو کہ انسانی فرد کی صحت اس لحاظ سے دیکھی جائے، کہ اس کے بدن کے اخلاط اور اعضاء میں ہرگز کوئی کمی بیشی اور خرابی نہ ہو، تو یہ بالکل ناممکن ہے۔ پس صحت کے معنی صرف یہ ہو سکتے ہیں کہ سب اخلاط اور اعضاء کے ملنے سے صحتِ تامّہ کے قریب قریب حالت پیدا ہو جائے۔ ایسے ہی انسانی اجتماع کی صحت کا حال ہے۔ اس کی صحّت سے مراد بھی صرف یہی ہو سکتی ہے کہ انسانی اِفراد کی افراط و تفریط مل کر کوئی نقطۂ اعتدال پیدا کرے") +

گویا حضرت امامؒ کے نزدیک اخلاقِ اجتماعی زندگی میں ظاہر ہوتے ہیں اور بہترین اخلاق وہ ہیں، جو اجتماعِ انسانی کی صحتِ عامہ (General Social Health) کے قریب تر آئیں +

غرض کوئی انسانی فرد محض فرد کی حیثیت سے ترقی کر ہی نہیں سکتا بلکہ اُسے سوسائٹی کا فرد بن کر رہنا پڑتا ہے۔ اس میں اس کی کئی حیثیتیں ہو سکتی ہیں۔ وہ ایک کنبے کا رکن ہے، وہ شہر کا باشندہ ہے، وہ قوم کا فرد ہے اور پھر ایک بین الاقوامی اجتماع کا رکن بھی ہے۔ اس طرح وہ ایک پیچیدہ انسانی سوسائٹی کا پرزہ ہے۔ وہ ان سب پر اثر ڈالتا ہے اور سب سے متاثر ہوتا ہے۔ یہی اثر و تاثر (Action & Reaction) اس کے اجتماعی اخلاق کا نقطۂ آغاز ہے +

اجتماع کا اثر اخلاق پر

اگر چھوٹے اور بڑے اجتماعات انسانی میں بسنے والے افراد کے اخلاق پر نظر ڈالی جائے، تو دیکھنے میں آتا ہے، کہ اُن میں بیّن فرق ہے۔ جوں جوں انسان بڑے بڑے اجتماعات کا رُکن بنتا جاتا ہے، اُس کے اخلاق میں صفائی، پختگی اور بلندی آتی جاتی ہے +

ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ حضرت امامؒ کے نزدیک انسان تین باتوں میں حیوانوں سے ممتاز ہے :-

(۱) انسان اجتماع کے فائدے اور رائے کُلّی کے لیے بھی کام کرتا ہے +

(۲) وہ اپنے افعال اور کردار میں حُسن کو سامنے رکھتا ہے +

(۴) وہ اپنے علوم کو تکمیلِ نفسی کے لیے استعمال کرتا ہے۔

اس کے بعد وہ دکھاتے ہیں، کہ انسان کے علوم اور اخلاق پر رائے کلّی، اجتماعیت وغیرہ کا کیا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ جب تمام علوم میں رائے کلّی دخل پالیتی ہے۔ یعنی علوم کو اجتماعی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، تو وہ حکمت کا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ جب غضب رائے کلّی کے ماتحت آجاتا ہے، تو وہ شجاعت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جب بلند آواز میں حُسن کا نمود ہوتا ہے، تو وہ سمجھنے کے قابل کلام بن جاتی ہے اور جب اس میں رائے کلّی اور اخلاق کا کمال شامل ہو جاتا ہے، تو فصاحت بن جاتی ہے۔ ایسے ہی تکبّر بُرا ہے، جب تک وہ انفرادی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جونہی وہ رائے کلّی یا اجتماعی نقطۂ نگاہ اختیار کر لیتا ہے، وہ خلق سماحت (سیر چشمی) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح جذبۂ جنسی انفرادیت کے غلبے کے ماتحت نہایت بُرا ہو سکتا ہے، لیکن جب رائے کلّی یا اجتماعی اخلاق کے اثر سے متاثر ہو جاتا ہے، تو وہ عفت بن جاتا ہے اور ایک قابل تعریف جذبہ ہو جاتا ہے۔[1]

معاشی حالات کا اثر اخلاقِ عوام پر حضرت امام صاحب اخلاق کی تعمیر میں معاشی حالات کو بہت حد تک مؤثر قرار دیتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ:-

اعلم ان الخواطر التی یجدھا الانسان فی نفسہ

---

[1] بدور بازغہ صفحہ ۲۹۔

وتبعثه علی العمل بموجبها لاجرم ان لها اسباباً کسنّة اللہ تعالیٰ فی سائر الحوادث والنظر والتجربة یظهر ان منها ... مزاجه الطبیعی المتغیر بسبب التدبیر المحیط به من الاکل والشرب و نحو ذٰلك (حجۃ اللہ البالغہ جلد اوّل، صفحہ ۲۷)

(یعنی انسان کے دل میں چھوٹے چھوٹے خیال پیدا ہوتے ہیں، وہ اسے کسی کام پر آمادہ کرتے ہیں انہیں خطرات کہتے ہیں۔ یہ خطرات خود بخود پیدا نہیں ہو جاتے، بلکہ جس طرح کارخانۂ الٰہی میں ہر ایک عمل کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے، ایسے انسان کے دل میں پیدا ہونے والے ان "خطرات" کے بھی بہت سے سبب ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک سبب تو جبلّت ہے (جس سے یہاں بحث نہیں۔ناقل) دوسرا انسان کا مزاج طبیعی ہے، جو انسان کے معاشی ماحول کے اثرات مثلاً کھانے پینے وغیرہ سے بدلتا رہتا ہے۔ یہ مزاجِ طبیعی بھی انسان کے دل میں کام کی خواہش پیدا کرنے کا ایک بڑا سبب ہوتا ہے +)

گویا سماج کے معاشی حالات انسان کے اندر اخلاق پیدا کرتے ہیں جو اس کے افعال کا نتیجہ ہوتا ہے، بہت زبردست اثر رکھتے ہیں +

ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ:۔

انما الاخلاق بالاحوال لا بالعلوم (بدور بازغہ صد ۱۸)

یعنی "انسانی اخلاق معلومات سے پیدا نہیں ہوتے، بلکہ ان حالات سے پیدا ہوتے ہیں، جن میں انسان گھر کر زندگی بسر کرتا ہے"۔

معاشیات کا مقام | یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت امامؒ عام حکماء کے خلاف اصلاحِ نفس کا کام اخلاق کے بجائے "لطیفہ جوارح" سے شروع کرتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انفرادیت پسند حکماء اور صوفیاء اخلاق کو ارتفاقاتِ معاشیہ پر مقدم کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ انسان کے ماحول کی اصلاح نہ ہونے کی وجہ سے تہذیبِ اخلاق کا کام عمومی تحریک نہیں بن سکتا۔ اس کے برخلاف حضرتِ امام ولی اللہؒ نے تہذیبِ نفس (Self-purification) سے پہلے ایک منزل لطیفۂ جوارح مقرر کی ہے، جس کی تفصیل آپ ہی کے الفاظ میں حسبِ ذیل ہے:-

درظاہرِ شرع، کہ مسمّی بہ اسلام است، مبحوث عنہ لطیفۂ جوارح است؛ تحقیق ایں لطیفہ آن است کہ قلب و عقل و نفس بہ اعتبارِ تقویم جوارح، و آلہ بودن برائے تکمیلِ افعالِ جوارح و فنا در جوارح مسمّٰی بہ لطیفۂ جوارح مے گردد۔ و برائے تفہیم ایں لطیفہ بریں فقیر شترے ظاہر ساختند کہ مشرف بر موت بود، غیر از رمقے از حیات با او باقی نماندہ و جمیع لطائفِ ثلاثۂ بارزۂ او ضعیف گشتہ، اما او را در قطارے بستہ بودند و او غیر از رفتن قوتے نداشت: پس تا آخر انزہاقِ روح راہ مے رفت، بعد ازاں بمرد؛ از رفتن باز ماندنش ہماں و مُردنش ہماں؛ دریں حال آگاہانیدند کہ ایں شتر فانی است در لطیفۂ جوارح و مواخذہ اعمال بر ہمیں لطیفہ است۔" (الطاف القدس ص ۲۵-۳۰)

یعنی ظاہر شرع میں، جسے اسلام کہتے ہیں، لطیفۂ جوارح سے بحث ہوتی ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ قلبؔ، عقلؔ اور نفسؔ تینوں انسان کے جوارح کے قیام کا سبب ہیں، انہی کے ذریعے جوارح کام کرتے ہیں اور یہ جوارح میں فنا ہیں، اس لیے یہ لطیفۂ جوارح کہلاتے ہیں یہ لطیف بات مجھے سمجھانے کے لیئے ایک اُونٹ میرے سامنے ظاہر کیا گیا، جو مرنے کے قریب تھا۔ اس میں برائے نام زندگی باقی رہ گئی تھی اور اس کی تینوں ظاہری قوتیں ضعیف ہوگئی تھیں۔ اس کے باوجود اُسے اُونٹوں کی قطار میں باندھا ہوا تھا اور اُسے چلنے ہی سے کام تھا۔ چنانچہ وہ روح کے نکلنے تک چلتا ہی رہا، اس کے بعد مر کر گر گیا۔ جونہی وہ چلنے سے رُکا موت نے اُسے آلیا۔ اس حالت میں مجھے بتایا گیا کہ یہ اُونٹ لطیفۂ جوارح میں فانی ہے اور ظاہری قوانین کے متعلق جو پرستش ہوتی ہے، وہ اسی لطیفے سے ہوتی ہے[1]+

اس کا مطلب یہ ہے کہ قلبؔ، عقلؔ اور نفسؔ کے دو رُخ ہیں۔ ایک انسان کے اعضاء و جوارح کی طرف، اس کی تکمیل کا نام شریعت ہے دوسرا رُخ اپنے منبع کی طرف، اس کی تکمیل کا نام احسانؔ، یا تصوفؔ یا طریقتؔ ہے اس کا ایک اور نام فلسفۂ الٰہی بھی ہے۔ یعنی انسان کی یہ تینوں قوتیں جب اس کے افعال ظاہری کی تہذیب کی طرف مائل ہوں، تو جن قواعد کی پابندی

---

[1] حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ جو فرمایا کرتے تھے کہ انسان کو اُونٹ کی طرح کام کرتے ہوئے جان دینی چاہیئے اور خود بھی اپنے اس قول پر عمل کرکے دکھایا، معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت امام صاحبؒ کے اسی قول سے لیا گیا ہے + (مرتب)

کریں گی، وہ ظاہری شرع ہے۔ یہی انسان کی ارتفاقی زندگی ہے۔ یہ تینوں قوتیں جب اپنے دوسرے رُخ یعنی بنیع کے لحاظ سے دیکھی جاتی ہیں، تو جن علمی اصول کی پابندی کرکے ترقی کرتی ہیں، وہ تصوّف یا فلسفۂ الٰہی کہلاتے ہیں۔

تمام انسان ایک جیسی استعداد لے کر نہیں آتے۔ بعض لوگ بعض چیزیں اپنی زندگی کی ابتدا میں سمجھ لیتے ہیں اور بعض نہیں سمجھ سکتے۔ چنانچہ خاص تیز فہم لوگ ان قوتوں کے دوسرے رُخ یعنی خدا تعالیٰ کے ساتھ ان کے تعلق کو براہِ راست ابتداءِ عمر میں سمجھ لیتے ہیں اور اسی کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن عوام کی یہ حالت نہیں ہوتی۔ وہ ان قوتوں کے اس رُخ کو پہلے سمجھتے ہیں، جس کا تعلق اُن کے بدنی افعال سے ہے وہ ان افعال کو درست بنانے کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آگے چل کر انہیں اُن قوتوں کے دوسرے رُخ کی طرف توجہ ہو جائے لیکن جہاں تک اُن کے افعال اور جوارح کی تہذیب کا تعلق ہے حضرت امام صاحبؒ کے نزدیک یہ بھی اُن کی انسانیت کی تکمیل کا ایک اہم جز ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے پہلی مرتبہ حضرت امام صاحبؒ نے ظاہر کیا ہے اور چونکہ اس کا تعلق انسانوں کی اکثریت کے ساتھ ہے، اس لیے اس کی پوری اہمیت سمجھ لینی چاہیے۔ اُس وقت معلوم ہوگا کہ اجتماعی زندگی اور معاشی حالات کی اصلاح کا جس سے انسان کے افعال پر گہرا اثر پڑتا ہے، انسان کی اندرونی اصلاح سے کتنا قریبی تعلق ہے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ:۔

عام طور پر تصوف، اخلاق سے شروع کیا جاتا ہے۔ معاشی ضروریات حیوانی زندگی کے لیے تسلیم تو کی جاتی ہیں، لیکن اُن کا انسانیت سے تعلق تسلیم نہیں کیا جاتا، جس کی وجہ سے ہماری سیاست کھوکھلی ہوگئی ہے اور ہمارے عقلمند اور با اخلاق لوگ سیاست سے الگ رہنا ہی اپنا کمال سمجھنے لگ گئے ہیں[۱]۔ لیکن حضرت امام ولی اللہ نے انسانی معاشی ضروریات کو انسانیت کا براہِ راست جُزء قرار دے کر سمجھا دیا ہے، کہ اِن ضروریات کو قابو میں لاکر "انسانی اجتماعی زندگی کے لیے اقتصادی نظام ایسا ہونا ضروری ہے۔ جو اُن کی ضروریات کو پورا کردے اور اس کے بعد ان کے پاس کچھ وقت بچ جائے۔ تاکہ وہ اپنے لطائف کی تکمیل پر غور کرسکیں[۲]"۔

اخلاقِ اربعہ: حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ کے نزدیک لطیفۂ جوارح سے مراد یہ ہے، کہ انسان مندرجۂ ذیل چار اخلاق اپنے اندر پیدا کرنے کی مشق کرے۔

(۱) طہارت (۳) سماحت

(۲) اِخبات (۴) عدالت

طہارت سے مراد ہے، بدن، لباس اور خیالات و عقائد کی پاکیزگی۔

اِخبات سے مراد ہے، صحیح علوم سے اتنی وابستگی کہ انسان ان

۱؎ مولانا عبیداللہ سندھیؒ: الفرقان، ولی اللہ نمبر، صـ ۳۲

۲؎ مولانا عبیداللہ سندھیؒ: الفرقان، ولی اللہ نمبر، صـ ۳۲

کی تعمیل کو اپنے لیے ضروری سمجھنے لگے اور پھر ان علوم کے منبع ـــ خداوند تعالیٰ ـــ کی اطاعت کو اپنے لیے لازم قرار دے لے۔

سماحت سے مراد یہ ہے کہ انسان دنیا کی چیزیں کھائے پیے، استعمال کرے۔ اُن سے فائدہ اُٹھائے، لیکن اُن کی محبّت اپنے دل میں نہ بٹھائے۔

عدالت سے مراد نہ صرف یہ ہے کہ انسان دُوسرے انسان کا حق نہ مارے بلکہ یہ بھی، کہ اپنے تمام اعمال و افعال میں میانہ روی اختیار کرے۔

غور سے کام لیا جائے، تو معلوم ہو گا، کہ ان چاروں خُلقوں کی تکمیل اجتماعِ انسانی کے اندر رہ کر ہی ہو سکتی ہے اور انسان کا ماحول اِن اَخلاق کی تکمیل پر بہت گہرا اثر ڈالتا ہے۔ ان میں سے آخری خلق تو خصوصیّت سے ایک ایسے نظام کا طالب ہے، جس میں انسان نہ خود کسی پر ظلم کرے، نہ کسی پر ظلم ہوتا برداشت کرے۔ حضرت امام صاحبؒ اسے ہی اجتماعِ انسانی کے قیام کا سبب بتاتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:۔

عدالت کی اہمیت | "خصلتِ چہارم عدالت است و آں خصلتے است کہ صدورِ اقامتِ نظامِ عادل و سیاستِ کُلّی از وے باشد"

(ہمعات "مطبوعہ بیت الحکمت، لاہور، ص۳۹)

یعنی "چوتھی خصلت عدالت ہے۔ انسانی سوسائٹی کے نظامِ عدل

کا انحصار اسی پر ہے، اسی سے اجتماعِ انسانی کی سیاستِ عالیہ بین الاقوامی۔سیاست چل سکتی ہے"۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ عدالت وہ ملکہ یا خصلت ہے، جس سے ایسا نظامِ عدل پیدا ہوتا ہے، جو نہایت آسانی سے تدبیرِ منزل اور سیاست مدنیہ اور بین الاقوامی اجتماعات کے قیام کا سبب بنتا ہے اس خُلق کی بنیاد اُس جذبۂ انسانیت پر ہے جس سے شوراویت پسند افکار پیدا ہوتے ہیں اور پھر وہ آگے چل کر اپنے مناسبِ حال سیاست پیدا کر لیتے ہیں، جو حکمتِ الٰہی کے مطابق ہوتی ہے[1]۔

اقتصادی خرابی کا اثر اخلاق پر حضرت امامؒ کے نزدیک اجتماعِ انسانی میں عدالت کے نہ ہونے ہی سے خرابی پیدا ہوتی ہے، جس سے انسانی سوسائٹی نہ صرف مادّی لحاظ سے برباد ہو جاتی ہے، بلکہ وہ اپنے اچھے اخلاق بھی کھو بیٹھتی ہے۔چنانچہ رومی اور ایرانی سوسائٹیوں میں اقتصادی لوٹ کھسوٹ اور اُمرا کی چیرہ دستیوں سے عوام پر جو اثر پڑا، اس کا نقشہ کھینچنے کے بعد حضرت امامؒ فرماتے ہیں کہ

فلما کثرت ھذہ الاشغال تشبح فی نفوس الناس ھیآت خسیسۃ واعرضوا عن الاخلاق الصالحۃ۔

(حجۃ اللہ البالغہ، جلد اوّل، ص۱۰۵)

یعنی "امراء عیاشیوں میں اور غربا چاپلوسیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم، ص۶۸

ان اعمال کی مشق کثرت سے ہونے لگتی ہے، تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگوں کے نفوس میں گندی شکلیں جمع ہو جاتی ہیں اور وہ اچھے اخلاق سے عاری ہو جاتے ہیں"۔

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت امامؒ کے نزدیک اقتصادی بدحالی اور معاشی اونچ نیچ عوام کی اخلاقی پستی اور بربادی کا سبب بنتے ہیں۔

معاشی حالات کی اصلاح کی ضرورت یہ ممکن ہے کہ بعض افراد اتنے بلند نظر، مضبوط کردار اور پختہ اخلاق ہوں کہ وہ معاشی بدحالی سے متاثر نہ ہوں۔ اس کی بیسیوں مثالیں ہر ایک سوسائٹی میں مل سکتی ہیں۔ لیکن اجتماع کے عام افراد کے اخلاق پر معاشی بدحالی کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امام صاحبؒ اجتماع اور افراد کی صلاحیت قائم رکھنے کے لیے معاشی نظام کی اصلاح ضروری قرار دیتے ہیں اور صاف صاف لکھتے ہیں کہ حکمتِ الٰہی جب نظام معاشی کی خرابی دیکھتی ہے، تو انقلاب لانے والی قوتوں کو بروئے کار لاتی ہے[1]۔

انبیاء اور ارتفاقات اس میں شک نہیں کہ انبیاء کرام اجتماع انسانی کی اصلاح کے لیے آتے ہیں، تو اُن کا اصلی مقصد ان طریقوں کی اصلاح ہوتی ہے:

---

[1] یہ انقلاب کبھی ان لوگوں کے ذریعے آتا ہے، جنہیں خدا تعالےٰ نئے علوم الہام کرتا ہے۔ کبھی اس اجتماع کے عقلمند لوگوں کے ذریعے آتا ہے۔ قرآن حکیم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ملہمین اور عقلمند دونوں انقلاب برپا کر کے کثیر مظلوم آبادی کو قلیل ظالم آبادی کے چنگل سے نہ بچا سکیں۔ تو قدرت اس خطے کی بربادی کے اسباب پیدا کر دیتی ہے۔ (مولانا عبید اللہ سندھیؒ)

جن سے انسان خدا تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلقات بہتر بنا سکیں، لیکن جیسے اُوپر دکھایا جا چکا ہے، چونکہ اجتماعی معاشیات کا اجتماعی اخلاق پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے اور سوسائٹی کا معاشی توازن خراب ہو جانے ہی سے عوام بداخلاقیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اس لیے انبیاء کرام کو لازماً اجتماعِ انسانی کی معاشیات و اقتصادیات کی اصلاح بھی کرنی پڑتی ہے، تاکہ غلط خیالات، غلط رسوم اور غلط عادات کی اصلاح ہو کر صحیح عادات پیدا ہو سکیں۔ چنانچہ حضرت امامؒ فرماتے ہیں کہ:۔

"اگرچہ انبیاء کی تعلیم کی اصلی غرض و غایت یہی ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ انسان کے تعلقاتِ عبودیت مختلف طریقوں اور شکلوں سے قائم کریں لیکن اس کے ساتھ رسومِ فاسدہ کی بربادی اور ارتفاقاتِ صالحہ کے قیام کی ترغیب بھی ان کے مشن کا جُز ہوتی ہے"۔ (حجۃ اللہ البالغہ جلد اول، صفحہ ۱۰۴)

یہ مُلہمین اس لیے نہیں آتے کہ انسان کی اجتماعی زندگی کو توڑ پھوڑ کر محض رہبانیت قائم کریں۔ چنانچہ حضرت امامؒ فرماتے ہیں کہ:۔

"اللہ تعالیٰ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ انسان اپنی تمدنی زندگی کے دوسرے درجے ارتفاقِ دوم، کو جس میں معاش، اکتساب، تدبیرِ خانہ، باہمی لین دین اور باہمی تعاون کی زندگی شامل ہے ترک کر دیں یا شہری زندگی سے بے توجہی برتیں اور نہ کسی نبی نے کبھی اس کا حکم دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء یہ کبھی حکم نہیں دے سکتے کہ لوگ پہاڑوں کی غاروں، جنگلوں اور بیابانوں میں جا بسیں، اجتماعی زندگی ترک کر دیں اور انسانی اجتماع کی بھلائی برائی سے الگ تھلگ زندگی بسر کریں۔ کیونکہ اس کا نتیجہ سوائے وحشت و بربریت کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ انھوں نے ہمیشہ ارتفاقی و تمدنی زندگی میں

اعتدال پیدا کرنے کی تلقین کی ہے "تاکہ نہ تو عوام ارتفاقات میں باریک بینیوں اور تکلّفات میں مبتلا ہو کر عیاشی کی زندگی بسر کرنے لگیں اور نہ وحشی و بربری اقوام کی سی زندگی میں مبتلا ہو جائیں"۔[1]

نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کی غرض: اصلاحِ ارتفاقات خود نبی آخرالزمان حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

كما كان الشر السارى فى زمن ابراهيم عليه السلام هو نسيان التوحيد نزل الحق بازائه باشاعة التوحيد و توليد العبادات من طهارة و صلوٰة و زكوٰة و حج و صوم و ذكر ولما كان الشر السارى فى زمن نبينا محمد صلى الله عليه وسلم اختلال الملل وانقلاب الارتفاقات خاصة على اصحابها وكان الامر اشد واقسى نزل الحق بازائه بالجهاد واشاعة العبادات وتوقيتها والقضاء بزوال دولة الروم والعجم وانتظام امر النبوة كهيئة الارتفاق الرابع، ففتح صلى الله عليه وسلم بابا من الخير لم يفتح قبله وانتظمت به امة من الناس هى خير امة اخرجت للناس (تفهیمات الالٰہیہ، جلد اوّل، صفحہ ۱۱۶)

یعنی "چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں انسانیت توحید کو بھول چکی تھی۔ اس لیے اس شر سے دنیا کو پاک کرنے کے لیے حق اس شکل میں نازل ہوا کہ توحید کی اشاعت کی جائے اور طہارت، نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ اور ذکرِ الٰہی کی عبادات پیدا کی جائیں۔

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۰۱

اس کے بعد ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک ملتوں میں خلل پڑ چکا تھا اور خصوصیت سے انسان کی معاشی اور تمدنی زندگی میں بدنظمی اور بے انصافی پیدا ہو چکی تھی اور یہ خرابی پہلی خرابی سے بھی زیادہ بُرے نتائج پیدا کرنے والی تھی اور اس کی خرابی بہت دُور تک پہنچ چکی تھی اس لیے اب عبادات کی اشاعت اور ان کے اوقات معین کرنے کے ساتھ جہاد کا بھی حکم ہوا اور حکمتِ الٰہی نے فیصلہ کیا کہ رومی اور ایرانی حکومتی نظاموں کو برباد کر دیا جائے اور نظامِ نبوی کو بین الاقوامی پیمانے پر منظم کیا جائے۔ چنانچہ اب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے نوعِ انسان کے لیے بھلائی کا وہ دروازہ کھل گیا، جو اب تک نہ کھلا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے انسانوں کی ایک ایسی جماعت منظم ہو گئی، جو نوعِ انسان کے لیے بہترین نمونے کا کام دینے والی تھی"[1]

غرض عوام کے معاشی اور اقتصادی حالات کی اصلاح اُن کے اخلاق کی اصلاح کے لیے شرطِ اوّل ہے۔ "اقتصادی نظام کی درستی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانی اجتماعیت کے اخلاق مکمل ہوں گے اور ان اخلاق کی تکمیل ہی قبر اور حشر کی مصیبتوں سے نجات دلائے گی۔ پھر ان اخلاق کی تکمیل دوسرے درجے پر جنّت کی نعمتوں سے مستفید کرے گی اور تیسرے درجے پر جا کر اُسے رؤیت ربُّ العالمین کے لیے تیار کر دے گی"[2]

[1] مولانا عبید اللہ سندھیؒ: الفرقان، ولی اللہ نمبر، صفحہ ۳۲

گیارھواں باب

ارتفاقاتِ الٰہیّہ

ابوابِ ماسبق میں انسان کی ارتفاقی زندگی کے معاشی پہلو کی ترقی اور ضروریات کی فراہمی کے طریقوں پر حکمت ولی اللّٰہی کے نقطۂ نگاہ سے مفصّل بحث ہوچکی ان ابواب کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی زندگی انسان کی زندگی کا ضروری لازم اور لابُد پہلو ہے۔ کوئی نظام، جو انسانیت کی تنظیم کا ارادہ کرے، انسان کی معاشی ضروریات سے چشم پوشی نہیں کرسکتا۔ لیکن حضرت امام ولی اللّٰہ دہلویؒ کے نزدیک، انسانیت، ان معاشی ضرورتوں کی فراہمی ہی پر ختم نہیں ہوجاتی؛ اور نہ یہ مقصودِ غائی ہے بلکہ انسانی معاشرے یا سوسائٹی میں خودِ معاشی تنظیم مساوات کی ایک خاص غرض و غایت اور ایک معنوی حاجت ہے، جس کی خاطر یہ سارا معاشی واقتصادی اور معاشرتی نظام صحیح اصول پر قائم کرنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک نقطہ ہے، جسے حضرت

اسلام جوہرِ بحت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہی انسان کی انسانیت، انانیت اور عقلیت کا مقام ہے۔ یہ نقطہ خداوندِ تعالیٰ کی تجلّی کو قبول کرتا ہے۔ اس لیے خدا کی ہستی کا اقرار اور اُس کے آگے جھکنے کا جذبہ انسانیت کا ایک لازم جزُ قرار پایا ہے +

صحیح معاشی نظام میں انسان کے اس جوہر یا جوہرِ بحت کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھا جائے گا اور اس کی صُورت یہ ہوگی کہ انسان کے معاشی نظام کو انسان کی عقل کے تابع رکھا جائے +

جب اس نظام کو عقل کے تابع لایا جائے گا، تو اُس کے اُوپر یہ جذبہ کارفرما ہوگا، کہ انسان مرنے کے بعد فنا نہیں ہوتا، بلکہ اُسے خدا کے سامنے اپنے تمام افعال اور اعمال کے لیے جواب دینا ہے۔ اُس وقت انسان کے اعمال کا فیصلہ اس نقطۂ نگاہ سے ہوگا، کہ ان اعمال سے انسانیتِ عامّہ کو کتنا فائدہ یا ضرر پہنچا۔ فیصلے کا یہ دن اٹل ہے اور کوئی شخص اس بازپرس سے بچ نہیں سکتا۔ اس لیے انسان کا فرض ہے کہ دنیا میں اس نظام کو خدا کے نائب کی حیثیت سے چلائے، نہ کہ خود مختار مطلق العنان کی حیثیت سے۔ جب انسان یہ سمجھ کر اس نظام کو چلائے گا، تو لامحالہ عقلمند ساتھیوں کے مشوروں کے ساتھ کام کرے گا اور اپنے نظام کی بنیاد ایثار پر رکھے گا +

جب کوئی شخص اپنا پیٹ کاٹ کر اپنے حاجتمند ہمسائے کی مدد کرتا ہے تو وہ ایثار ایک درجہ طے کر لیتا ہے۔ جب وہ اپنے سارے گھرانے کو

اس درجے پر لے آتا ہے، تو ایثار کے پہلے درجے سے بلند ہو کر اس مقام پر پہنچ جاتا ہے، کہ اپنے خاندان کی ضرورتیں پسِ پشت ڈال کر غریب اور بے کس لوگوں کی مدد کرے۔ یہ یقیناً پہلے کی بہ نسبت بہت بلند درجے کا ایثار ہے جب کسی قوم کے افراد ایثار اور قربانی کے اس درجے پر پہنچ جائیں، تو وہ بہت بلند درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ ہے وہ چیز جو قرآنِ حکیم اس مختصر فقرے میں ظاہر کرتا ہے کہ:-

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر: ۹)

[یعنی جو حاجت مندوں کی حاجتیں پوری کرنے میں اپنی ضرورتیں پسِ پشت ڈال دیتے ہیں]۔

کسی اجتماع میں یہ اجتماعی ایثار اُس وقت پیدا ہوتا ہے، جب مرنے کے بعد کی زندگی کا تصوّر پوری طرح گھر کر لیتا ہے۔ کسی اجتماع میں مرنے کے بعد کی ذِمّہ داری کا جتنا زیادہ احساس ہوگا، اُتنا ہی وہ اجتماع زیادہ سرمایہ شکن اور عادِل ہوگا اور جتنا یہ احساس کمزور ہوگا، اُتنا ہی وہ کم سرمایہ شکن اور عدالت میں کمزور اور ظلم اور بے راہ روی میں زوردار ہوگا۔

اگر ارتفاقاتِ معاشیہ کو عقل اور خدا ترسی کے تحت چلانے کے بجائے حیوانی دواعی کے تحت رکھ کر چلایا جاتا ہے، تو لامحالہ کسی نہ کسی رنگ کی مطلق العنانی اور استبداد (Despotism) پیدا ہوتا ہے، جس میں ایک مختصر مضبوط جماعت کمزور اور غریب طبقے سے انتفاع (Exploitation) کرتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی کی دولت اُس مختصر گروہ میں چکّر

لگاتی رہ جاتی ہے اور ذرائع پیداوار پر اُسی گروہ کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اس اقتصادی غلبے سے وُہ اپنے لیے سوسائٹی پر سیاسی غلبہ پیدا کر لیتا ہے اور اس طرح اس کا سلسلۂ انتفاع (Exploitation) وسیع ترین حدود تک پھیل جاتا ہے، لیکن سوسائٹی کا اکثر حصّہ بربادی کے قریب پہنچ جاتا ہے۔

ایک سماج یا قوم کے اندر اس قسم کا نظام پیدا ہو جانے کے بعد، بعض اوقات یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کمزور سماجوں سے بھی ناجائز فائدہ اُٹھائے اور انہیں بھی اقتصادی غلبے کے تحت لاکر سیاسی غلامی کی جکڑبندیوں میں باندھ لے۔ اسے شہنشاہیت یا امپیریلزم (Imperialism) کہتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے گروہ کے ہاتھوں انسانی آبادیوں کے ناجائز انتفاع (Exploitation) کی یہ بدترین شکل ہے، جو اب تک پیدا ہوئی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سی اقوام ایک قوم کے چند افراد کے لیے سامان عیش و تعیش فراہم کرنے کے لیے وقف ہو جاتی ہیں اور انسانیت کا کثیر طبقہ اُن اخلاقی اقدار سے محروم رہ جاتا ہے، جو انسانیت کی بنیاد ہیں اور جن کا اجمالی ذکر گزشتہ باب میں آچکا ہے۔

انسان کے حجرِ بحث کو بیدار کرنے اور اس طرح اُسے مرنے کے بعد کی زندگی کے لیے تیار کرنے کا نام امام صاحبؒ کی زبان میں اقتراب ہے اور جن طریقوں سے یہ کیفیت حاصل ہوتی ہے، اُنہیں ارتفاقاتِ الٰھیہ کہتے ہیں۔

حکمتِ ولی اللٰھی میں جس طرح ارتفاقاتِ معاشیہ انسان کی طبعی ضرورتیں پوری

کرنے کے ایک پہلو کا نام ہے، اُسی طرح ارتفاقاتِ الٰہیّہ انسان کی زندگی کے دُوسرے پہلو کی ضروریات پوری کرنے کا نام ہے۔ یہ دونوں انسانیت کی تکمیل کے لیے لازم ہیں، جو ارتفاقاتِ معاشیّہ ارتفاقاتِ الٰہیّہ کے اُصول کے خلاف ہوں، وہ انسانیت کے لیے مُہلک ہیں اور جو ارتفاقاتِ الٰہیّہ انسان کے ارتفاقاتِ معاشیّہ کو مہمل کرنے والے ہوں، وہ خلافِ فطرتِ انسانی ہیں۔ ایسے ہی جس سوسائٹی میں ارتفاقاتِ معاشیّہ پر زور دیا جائے گا اور ارتفاقاتِ الٰہیّہ سے غفلت برتی جائے گی، وہ استبداد (Despotism) اور شہنشاہیت (Imperialism) میں مبتلا ہو کر برباد ہو جائے گی اور جس سوسائٹی میں ارتفاقاتِ الٰہیّہ پر زیادہ زور دیا جائے گا اور ارتفاقاتِ معاشیّہ کو ترقی نہیں دی جائے گی، وہ غلامی میں مبتلا ہو کر اخلاقِ فاضلہ سے محروم ہو جائے گی۔

اس کتاب کا دائرۂ فکر ارتفاقاتِ الٰہیّہ کی تفصیل کا متحمل نہیں ہے۔ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ نے اس موضوع پر اپنی تصنیفات، حجۃ اللہ البالغہ، بدورِ بازغہ، تفہیمات الٰہیّہ، سطعات، ہمعات وغیرہ میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ ہم نے یہاں ارتفاقات الٰہیّہ کا مختصر تذکرہ صرف اس غرض سے کر دیا ہے، کہ ارتفاقاتِ انسانی کا خاکہ مکمّل ہو جائے۔ تفصیلات کے لیے مذکورۂ بالا کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

خاتمہ

حضرت امام الحکمت، امام ولی اللہ دہلویؒ کے حالات، تعلیمات اور ان کے فلسفے کا اجمالی بیان پڑھ لینے کے بعد یہ بات صاف ہو جاتی ہے، کہ حضرت امام صاحبؒ دورۂ حکمت کے امام ہیں اور حق یہ ہے کہ انہوں نے حکمت کے اصول قائم کرنے میں اپنا فرض پوری طرح سے ادا کر دیا ہے۔ آپ کی حکمت انضمامی (Integralistic) ہے۔ یعنی اس میں انسان کی معاشی اور عقلی و روحانی پہلوؤں کو جمع اور مربوط کیا گیا ہے، اس حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی تعلیمات اب عملی رنگ میں عوام میں پھیلیں۔ اس کا انجام یہ ہوگا، کہ ان کے ذریعے ایسا انقلاب برپا ہوگا، جو عوام کی مادّی اور عقلی دونوں قسم کی ضرورتیں پوری کرے گا۔ تاریخِ اسلام میں امیر معاویہؓ سے سلطانیت کا جو دَور شروع ہوا، وہ سلطان عالمگیرؒ پر ختم ہو گیا۔ اس دَور کی خصوصیت بادشاہی تھی، جو قرآنِ حکیم کے تحت کام کرتی رہی۔ گو کبھی کبھی ایسے ارتجاع پسند بادشاہ بھی آئے، جو اپنا ذاتی قانون چلاتے تھے۔ لیکن ہر ایک ارتجاع کے بعد ایسا انقلاب آتا رہا، جس کے بعد قرآنِ حکیم کے قانون کو چلانے والا بادشاہ تخت پر متمکن ہو جاتا تھا۔ یہ سلسلہ سلطان عالمگیرؒ ۱۷۰۷ء

تک جاری رہا، جب شاہی نظام کے ختم ہونے کے بعد اُس دَور کا آغاز ہوتا ہے، جس کی خصوصیّت حکمت کی اشاعتِ عامّہ ہے*

اگر تمام دنیا کی اقوام کی تاریخ کا متوازی کا مطالعہ کیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے، کہ اسی زمانے کے قریب یورپ میں دورۂ حکمت (Scientific Age) شروع ہوتا ہے۔ مشین ایجاد ہوتی ہے، جس سے صنعتی انقلاب آتا ہے اور سیاسی لحاظ سے ہر ملک میں پادشاہی کے خاتمے پر قومی حکومت قائم ہوتی نظر آتی ہے۔ اِسی زمانے میں حضرت امام ولی اللہ کی تحریک تجدید و انقلاب ایک معیّن پروگرام کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ وہ آنے والے دَور کے پیشِ نظر ارتقاءِ انسانی کا وہ فلسفہ پیش کرتے ہیں، جس میں خداپرستی کے ساتھ دنیاوی ترقی کے اُصول بھی وابستہ ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے، جب وہ اعلان کرتے ہیں کہ جب کوئی قوم بین الاقوامی مقام سے گر جائے ــ جیسے مسلمان اُس وقت ہند میں گر رہے تھے ــ تو اُسے قومیّت کی منزل پر ٹھہر کر سانس لینی چاہیے۔ مگر اس میں بین الاقوامی عدل کے تصوّرات محفوظ کر لینے چاہییں۔ اگر برعظیم پاک و ہند کے لوگ اس حکمت کو سمجھ لیتے، تو جب یورپ کے استبدادی بین الاقوامی نظامات ٹوٹنے کے بعد قومی نظامات پیدا ہوئے، جو اَب پھر بین الاقوامیت کی طرف آ رہے ہیں، تو ہند میں (اور اس کے بعد ایشیا میں بھی) بین الاقوامی نظام کی شکست کے بعد قومی طرز کی حکومتیں پیدا ہو جاتیں۔ جیسے اب افغانستان، ایران، عراق، شام، لبنان، مصر، نجد

لیبیا، طرابلس، الجیریا اور مراکش وغیرہ میں پیدا ہو رہی ہیں اور بہت ممکن تھا کہ اس برعظیم میں بھی حضرت امام صاحبؒ کے اُصول پر یورپ کے متوازی، مگر اس سے بہتر اور صالح تر بین الاقوامی نظام پیدا ہو چکا ہوتا لیکن اس حکیم کی آواز پر کان نہ دھرنے کا نتیجہ یہ نکلا، کہ یہاں ایک غیر ملکی حکومت قائم ہو گئی، جس کی وجہ سے اس برعظیم کی ترقی تقریباً دو صدی پیچھے جا پڑی ۔

یورپ میں ایجادات اور صنعتی ترقّی کے نتیجے کے طور پر جو انقلاب آیا، اُس سے ایک طرف وسیع پیمانے پر سرمایہ پرستی پیدا ہو گئی اور دوسری طرف مذہب کو سیاست سے الگ کر کے محض ایک پرائیویٹ چیز بنا دیا گیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یُورپ کی سیاست، خصوصاً بین الاقوامی سیاست، کسی ضابطۂ اخلاق کی پابند نہ رہی اس کی وجہ سے وہ ہر قسم کی غدّاری اور عہد شکنی کا ہم معنی بن کر رہ گئی۔ اس کا انجام یہ ہے کہ وہاں کسی معاہدۂ صلح پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عدم اعتماد اور سرمایہ داری دونوں مل کر آئے دن خوفناک تر جنگیں پیدا کرتی رہتی ہیں چنانچہ اس کے نتیجے کے طور پر دو عالمگیر جنگیں (18-1914 اور 44 - 1939) لڑی جا چکی ہیں اور تیسری کے حالات پیدا ہو رہے ہیں (1969) اب کے ان حالات کی سربراہی براعظم شمالی امریکہ سے ہو رہی ہے، جس کے لیڈر دنیا بھر میں اپنے استبداد کا جال پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں اور خود اپنے ملک کے اندر حبشیوں کو کچلنے میں

مصروف ہیں۔ مگر یہ حالت اب دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر مغرب کو اپنی علمی ترقی محفوظ رکھنی ہے، تو اُسے سرمایہ پرستی ترک کر کے ایسے بین الاقوامی نظام کی طرف آنا ہوگا، جس کی بنیاد عدل (Justice) اور صدق (Truth) پر ہو۔ یہ وہ اصول ہیں، جو ارتفاقِ چہارم یعنی انسان کی ترقی کی بین الاقوامی منزل کے لیے حضرت امام الحکمت رح نے پیش کیے ہیں۔

حضرت امام الحکمت رح کا فلسفہ سرمایہ پرستی (Capitalatory) کے استیصال کو انسانیت کی سب سے بڑی ضرورت قرار دیتا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسا عادلانہ نظام پیش کرتا ہے، جس پر دنیا ایک مرتبہ عمل کر کے اطمینان کا سانس لے چکی ہے یہی نظام ہے، جس کے قیام کے لیے حضرت امام ولی اللہ رح کی جماعت کوشش کرتی رہی ہے۔ اگر امام ولی اللہ رح کا یہ فکر اس برعظیم میں قبول کر لیا جاتا، تو یورپ آج جس ارتفاقِ اعلیٰ کا مالک ہے، یہ برعظیم اس سے بہتر ترقی کا مالک ہوتا مگر افسوس ہے یہاں کے سوچنے والے طبقے نے حضرت امام ولی اللہ رح کے اس فکر کی قدر نہ کی اور صرف بادشاہت کے زندہ کرنے کے خواب دیکھتے رہے اور یہ نہ سمجھے، کہ جس منزل سے انسانیت گزر چکی ہے، اُس کی طرف وہ واپس نہیں لوٹ سکتی۔ زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ اب بھی اہلِ فکر اس فکر کی طرف جلدی متوجّہ نہیں ہو رہے اور نہیں سوچتے کہ قرآنِ حکیم بادشاہتوں کے ساتھ نہیں چل سکتا اور نہ محدود الخیال قوم پرستی ہمیں ترقی کی طرف لے جا سکتی ہے۔ اب صرف یہ ہو سکتا ہے، کہ قرآنِ حکیم کی انسانیت بخش حکمت عوام تک پہنچائی

جائے اور وہ اُسے اپنا کر اپنے ارادے سے کسی قسم کی شورادیت پیدا کر لیں جس میں اِس تعلیم کو حاکم بنالیں ۔

ہمارے خیال میں یہ ناممکن ہے کہ انسانیت چلتی رہے اور اس کے وُہ اُصولی قوانین جو قرآن حکیم میں منضبط ہیں، غائب ہو جائیں۔ اگر انسانی دنیا کو چلنا ہے، تو قرآنِ حکیم کو ایک حاکم کی حیثیت سے اوپر لانا ہوگا اور آج اُسے اوپر لانے کی وہی شکل ہوگی، جو حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ نے تجویز فرمائی ہے کہ قرآنِ حکیم کو نصب العین بنا کر ایک جماعت اس کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جائے۔ اِس انقلاب کا نقطۂ آغاز ایک ایسی سٹیٹ کا قیام ہے، جو قرآن کی مقرر کردہ بین الاقوامی منزل کو اپنے سامنے رکھے۔ یہی قرآنِ حکیم کی تعلیم کی بلند ترین عملی صورت اور "اتمام نعمت الٰہی" ہے۔ یہی وہ راستہ ہے، جس پر چل کر پہلے عربوں نے، پھر ایرانیوں اور ترکوں نے ترقّی کی۔ اسی راہ پر برعظیم پاک و ہند کو گامزن ہونا ہوگا اس حقیقت کو ہمارے اہلِ فکر جتنی جلدی سمجھ لیں، اتنا ہی اچھا ہے۔ نام نہاد عالمِ اسلام کی بین الاقوامی سیاست نے آج کل مغرب کے استیلا کی وجہ سے ہمارے لیے صرف یہی ایک صورت باقی رہنے دی ہے۔ اب ہمارے لیے اس کے سوا کوئی راستہ کھلا نہیں ۔ واللہ المستعان ۔

مطبوعات متعلقہ فکرِ ولی اللّٰہی

قرآن حکیم کی حکیمانہ انقلابی تفسیر کا بے نظیر سلسلہ

از امامِ انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ

۱- قرآنی دستورِ انقلاب : یعنی سورہ مزمّل و مدّثر کی تفسیر ۳٫۲۵ روپے
۲- قرآنی جنگِ انقلاب : یعنی سورہ محمدؐ (قتال) کی تفسیر ۱٫۷۵ //
۳- قرآنی عنوانِ انقلاب : یعنی سورہ فتح کی تفسیر ۲٫۲۵ //
۴- قرآنی اساسِ انقلاب : یعنی سورہ فاتحہ کی تفسیر ۲٫۰۰ //
۵- قرآنی اصولِ انقلاب : یعنی سورہ عصر کی تفسیر ۰٫۵۰ پیسے
۶- قرآنی فکرِ انقلاب : یعنی سورۂ اخلاص اور معوذتین کی تفسیر ۰٫۷۵ //

دیگر مطبوعات

۱- محمودیہ مع اردو ترجمہ عبیدیہ - جس میں امام ولی اللہ دہلویؒ کے ارشادات اور دعوت اور انقلابیت کی تعیین خود ان کی تصنیفات وغیرہ سے لی گئی ہے - از حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ ۲٫۵۰ روپے

۲- ارتفاقاتِ معاشیہ یعنی امام ولی اللہ دہلوی کا فلسفہ عمرانیات و معاشیات از شیخ بشیر احمد بی- اے، لودیانوی

۳- اردو شرح "حجۃ اللہ البالغہ" (مبحثِ اول و دوم) از حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ

۴- اجتماعی دور کے مسائل اور ان کا حل : فلسفہ امام ولی اللہ دہلویؒ کی روشنی میں، از محمد مقبول عالم بی- اے ۰٫۲۵ پیسے

۵- مختصر تعارفِ حالات و فلسفہ امام ولی اللہ دہلویؒ (بزبان انگریزی) از شیخ بشیر احمد بی- اے، لودیانوی ۰٫۲۵ //